امامِ تصوّف

حضرت جُنید بغدادی رحمتہ اللہ علیہ

یُونس ادیب



مطبوعات شیخ غلام علی، اَدبی مارکیٹ، چوک انار کلی، لاہور

روشن کتابیں گھر گھر پہنچانے کے عظیم منصوبے کے تحت

حضرت جُنید بغدادیؒ

کے حالاتِ زندگی اور افکار و نظریات پر

ایک اہم کتاب

امامِ تصوّف

مؤلّف:

یُونس ادیبؔ



مطبوعات شیخ غلام علی

ادبی مارکیٹ، چوک انارکلی، لاہور

پیارے قارئین!

حضرت ابوالقاسم جنید بغدادیؒ کے حالاتِ زندگی، افکار و نظریات اور تعلیمات پر مشتمل ایک ٹھوس اور مستند کتاب "امامِ تصوف" پیشِ خدمت ہے۔ جناب یونس ادیب، تصوف کے موضوع پر گہرا علم اور وسیع تجربہ رکھتے ہیں۔ چنانچہ قبل ازیں وہ اپنی کئی کُتب میں تصوف کے رنگ بکھیر چکے ہیں۔ صوفی بزرگوں سے قریبی تعلق نے اُن کی سوچ اور اندازِ تحریر کو ایک نیا رنگ اور اسلوب بخشا ہے۔ 'امامِ تصوف' اِس اعتبار سے ایک مکمل کتاب ہے کہ اِس میں حضرت جُنید بغدادیؒ کے حالاتِ زندگی اور شخصیت کا ذکر کرتے ہوئے مصنف نے متصوفانہ مسائل کو بھی نہ صرف بڑے انوکھے اور خوش رنگ پیرائے میں بیان کیا ہے۔ بلکہ بعض ایسے اُمور، جو بحث و تمحیص کے متقاضی تھے، ایک کُھلی ہوئی کتاب کی طرح واضح کر دیے ہیں۔

حضرت جنید بغدادیؒ کے ذکر کے ساتھ مصنف کے فن اور شخصیت پر بھی اظہارِ خیال کی بہت گنجائش ہے۔ لیکن ہمارا نصف صفحہ کا اداریہ شاید اُن کے ساتھ انصاف نہ کر سکے۔ یونس ادیب کا یہ قرض ہمارے سر ہے۔

قارئین! روشن کتابوں کی اشاعت اب مستحکم بنیادوں پر اُستوار ہو چکی ہے۔ اِس میں ہمارا کوئی خوبی نہیں۔ خُدا کا بے پایاں فضل و احسان اور قارئین کا شرفِ پذیرائی ـــــ یہ دو اسباب ایسے ہیں جنھوں نے کسی ایک قدم پر بھی ہمیں شرمندہ نہیں ہونے دیا۔ بعض لوگوں کی عادت ہوتی ہے کہ وہ معمولی سا کام کرنے کے بعد رائی کا پہاڑ بنا دیتے ہیں ـــــ خُدا کا شکر ہے کہ اُس نے ہمیں اِس قسم کے واویلوں سے دُور رکھا ہے۔ اچھا کام خود ہی منظرِ عام پر آجاتا ہے اور اپنے پرائے سب کو داد دینے پر مجبور کر دیتا ہے۔

قارئین! مُسلم شخصیات کا انسائیکلوپیڈیا، ہر ماہ کی دسویں تاریخ کو باقاعدگی کے ساتھ آپ تک پہنچ رہا ہے۔ ہمیں پُورا یقین ہے کہ آئندہ بھی اس باقاعدگی میں کوئی بے قاعدگی نہیں ہوگی ـــــ اِس ماہ ہم جس عظیم شخصیت کے محاسن کا جائزہ پیش کر رہے ہیں وہ کسی تعارف کی محتاج نہیں ـــ اُسی کی زندگی سے کائنات کے ذرّے ذرّے کو زندگی نصیب ہُوئی۔ ہم اور آپ اُسی کے صدقے زندہ ہیں ـــ سب رسُولوں کے سرتاج، فخر الانبیاء حضرت محمد مصطفیٰ صلی علیہ وسلّم ؎

زُباں پہ بارِ خُدایا یہ کس کا نام آیا
کہ میرے نطق نے بوسے مری زُباں کے لیے

مُسلم شخصیات کا انسائیکلوپیڈیا، آج اپنے دامن میں حضور پاک صلی اللّٰہ علیہ وسلّم کی سیرتِ طیبہ اور حیاتِ مقدسہ کے گلہائے رنگا رنگ لیے ہُوئے ہے۔ انہی پھُولوں کی بھینی بھینی خوشبُو سے اپنے دلِ درماندہ کو سکون دیجیے اور نگاہِ پژمردہ کو تراوت بخشیے!

نیاز احمد

دُنیا کی ہر قومی اور علاقائی
زبان کی روشن کتابوں کا انتخاب



نگران : شیخ نیاز احمد
مُدیرِ مسئول : ارشد نیاز
مُدیر : رب نواز ملک

مجلسِ مشاورت :
اے حمید۔ محمد حنیف شاہد
عینکاف خالد



طابع : شیخ نیاز احمد
مطبع : غلام علی پبلشرز، لاہور



ادارہ :
مطبوعاتِ شیخ غلام علی
اُردو بازار کیٹ، چوک انارکلی، لاہور

فون نمبر:
۴۱۳۰۲۰ ۶۱۸۵۹ ۵۲۹۰۸



تار:
کتاب مین (KITABMAN) لاہور

اسلامی تصوف کے مؤرخین میں حضرت جنید بغدادی رحمۃ اللہ علیہ تیسری صدی ہجری کے اس دور میں مینارۂ نور کی حیثیت سے نظر آتے ہیں۔ جب عباسی دورِ خلافت زوال پذیر تھا اور ایک علمی ادبی مرکز کی حیثیت سے بغداد دنیا بھر کے علم دوستوں کے لیے انتہائی پُرکشش تھا۔ اسلامی فتوحات خوشحالی اور اقتصادی ترقی کے باعث بغداد کی سیاسی اور دینی زندگی کے معاملات پر نو بہ نو بیرونی اثرات اس حد تک شدید تھے کہ شریعت و طریقت کے نظامِ افکار میں تیزی سے تبدیلیاں واقع ہو رہی تھیں۔ الٰہیات، فقہ، ادب اور فلسفے کے متضاد نظریات پر مبنی کئی ایک مکتبۂ فکر وجود میں آگئے تھے اور ذہنی انارکی اپنی اس انتہا پر پہنچ گئی تھی کہ متشددانہ سیاسی تحریکوں سے معاشرتی و سماجی زندگی دہشت زدہ تھی۔ اباحی اور قرامطہ کی ملحدانہ دیوانگی، بصرہ کے غلاموں کی بے چینی اور طبقاتی کشمکش نے بھی ان نام نہاد ترقی پسندانہ نظریوں کے فروغ کے لئے بنیاد مہیا کی جو شریعت اور طریقت کے درمیان کسی تعلق کو درست قرار نہیں دیتے تھے۔ ان حالات میں اقتدارِ اعلیٰ کے تحفظ کے لئے عباسی خلفا کا نقطۂ نظر بالکل سیاسی نوعیت کا تھا اور عوام جن کا اسلامی نظریہ انتہائی سیدھا سادھا تھا اسلامی فلسفہ و سائنس کی تشکیل کے نام پر پُرپیچ اور ناقابلِ فہم علمی رویوں سے بالکل غیر مطمئن تھے۔ مذہبی فرقوں کے درمیان چپقلش اور نظریاتی تصادم اور عبادات دینی فرائض کو عقل کی کسوٹی پر پرکھنے کے عمل سے دین کی کھلم کھلا خلاف ورزی کی جا رہی تھی، خدا کی وحدانیت کے قرآنی تصور میں آمیزش کو ترقی پسندانہ جرأت قرار دیا جا رہا تھا، فنون و ادب کے نام پر سطحی خیالوں اور تعیش پرستی کے رجحانات عام تھے۔ سیاسی و دینی معاملات میں فیصلے کا حق صرف ان مفکروں کے پاس تھا جنہیں حکمران طبقے کی سرپرستی حاصل تھی اور مخالف نظریات رکھنے والوں کو عتاب کا نشانہ بنایا جاتا تھا۔ اس صورت حال میں صوفیانہ طرزِ فکر کا ڈھانچہ بھی تبدیل ہو کر رہ گیا تھا اور اسلامی تصوف جس کی نمو اسلام کی مروجہ تعلیمات کی رہنمائی میں ہوئی تھی، ہندی ویدانیت یونانی فلسفہ الوہیت اور ایرانی تہذیب و تمدن کی اثر آفرینی سے اس کا اسلام کی بنیادی تعلیمات سے کوئی تعلق نہ رہا تھا اور انسان کے خدا کے ساتھ تعلق اور اس کے تقاضوں کی نئی نئی تعبیرات نے اتنا الجھاؤ اور ابہام پیدا کر دیا تھا کہ اگر حضرت جنید بغدادی رحمۃ اللہ علیہ اس وقت صوفیانہ نظامِ افکار اور فقیہانہ مسائل کے بارے میں انقلابی فکر و عمل اختیار نہ کرتے تو یقیناً آج اسلامی تصوف کی شکل کچھ اور ہوتی۔

اس پس منظر میں حضرت جنید بغدادی رحمۃ اللہ علیہ کی شخصیت اور ان کے صوفیانہ نظریات کا مطالعہ کرنے سے حقیقت اور زیادہ واضح ہو جاتی ہے کہ اس پُرآشوب دور میں حضرت جنیدؒ ہی وہ جلیل القدر ہستی تھے جنہوں نے اپنے عمل، اپنی تعلیمات اور افکار سے ایک ایسے انقلابی عمل کی بنیاد رکھی جس سے شریعت و طریقت کے مابین نظریاتی فرق ختم ہوا اور روحانی زندگی گذارنے کا عمل پھر سے قرآن و سنت کے سانچے میں ڈھل گیا۔ چنانچہ تاریخ میں حضرت جنید بغدادیؒ کو انقلابی طرزِ فکر کی بنیاد پر ایک عظیم الشان مکتبۂ فکر کی حیثیت حاصل ہے اور نہ صرف اس دور کے اسلامی نظریات پر اس کے گہرے اثرات ہوئے بلکہ ہر زمانے میں اسلامی تصوف کی تاریخ کا عمل ان ہی اثرات کے تابع رہا اور آج بھی اسلامی تصوف کے مختلف سلسلوں میں حضرت جنید بغدادی رحمۃ اللہ علیہ کو نظریاتی رہنما کی حیثیت حاصل ہے۔

اسلامی تصوف کی تاریخ میں بغدادی مکتبۂ فکر کے تخلیق کنندہ حضرت جنید بغدادی رحمۃ اللہ علیہ کا سوانحی "تذکرہ" ان کا روحانی رتبہ اور تعلیمات درحقیقت ایک ایسا انقلابی منشور ہے جو صدیوں سے حقیقتِ الوہی کے متلاشیوں کے لئے حکمت و بصیرت کا سرچشمہ بنا ہوا ہے۔ اسلامی علوم کی دنیا میں حضرت جنید بغدادی رحمۃ اللہ علیہ ایک مسلمہ معلم قرار دیئے گئے ہیں اور علم و تحقیق کے میدان میں ہر دور کے عالموں اور محققوں نے ان کے نظریات کو علم و تجربے کے طور پر قبول کیا ہے۔ حضرت جنید بغدادیؒ کے بارے میں تحقیق و تجسس کا عمل بھی اُسی دور سے جاری ہے جب وہ تقدس و وقار کے ساتھ تیسری صدی ہجری میں رشد و ہدایت کی شمع بنے ہوئے تھے اور آج بھی ایشیا اور یورپ کی دانش گاہوں میں ان کے افکار و اقوال پر مسلسل کام ہو رہا ہے۔ تصوف کے قدیم و جدید لٹریچر پر حضرت جنید بغدادی رحمۃ اللہ علیہ کی شخصیت اور علم و تجربہ کا ہی روشن سایہ نظر آتا ہے اور اس سے اکتسابِ فیض کرنے والے جلیل القدر صوفیہ نے جنیدی نصابِ تصوف کو ہی مستند قرار دیا ہے۔

حضرت جنید بغدادی رحمۃ اللہ علیہ کے آباؤ اجداد ایران کے شہر نہاوند کے باسی تھے نہاوند ایران کے شہروں میں خوبصورت شہر کی حیثیت سے مشہور رہا۔ یہاں صنعت و حرفت اپنے عروج پر تھی، لوگوں کی اکثریت تجارت پیشہ تھی اور پھل دار باغوں سے سجا ہوا شہر اپنے باسیوں کے لیے سماجی اور معاشرتی عزت کی علامت تھا۔ نہاوند کے رہنے والے انتہائی جفاکش اور محنتی تھے اس شہر کی تاریخ طوفانِ نوحؑ سے بھی پہلے کی بیان کی جاتی ہے اور ۲۱ ہجری میں اسے حضرت عمرؓ کے عہدِ خلافت میں اسلامی سلطنت کا حصہ بنایا گیا جس پر بے انتہا قربانیوں کے بعد فتح حاصل کی گئی تھی اور اس فتح کے بعد جب ایران میں اسلام کو فروغ حاصل ہوا تو دو تین نسلوں بعد اپنے خاندان کے ساتھ حضرت جنید بغدادی رحمۃ اللہ علیہ کے والد بغداد میں آباد ہو گئے جہاں انہوں نے شیشہ گری کا کام شروع کیا۔ حضرت جنید بغدادی بھی بغداد میں پیدا ہوئے۔ ابھی وہ بچے ہی تھے کہ ان کے والد کا انتقال ہو گیا اور ان کے ماموں حضرت سری سقطی رحمۃ اللہ علیہ نے انہیں اپنی نگرانی میں لے لیا۔ حضرت سری سقطی رحمۃ اللہ علیہ اس وقت کے بغداد کے معززین میں شمار ہوتے تھے اور زندگی کے ہر طبقے میں انہیں عزت و احترام کی نظر سے دیکھا جاتا تھا۔ دانشوروں، عالموں، سیاست دانوں اور بغداد کے صوفیہ سے ان کے گہرے مراسم تھے۔ گرم مصالحے کی تجارت کرتے تھے اور شہر کے سب سے بارونق بازار میں ان کی دکان تھی۔ ایک دن بازار میں آگ لگ گئی اور کئی دکانیں جل گئیں۔ اس وقت حضرت سری سقطیؒ گھر میں تھے کہ انہیں کسی نے بتایا کہ ان کی دکان بھی جل گئی ہے۔ یہ سن کر انہوں نے کہا۔

"شکر ہے اللہ کا۔ میں مال و اسباب کی حفاظت کی ذمہ داری سے آزاد ہو گیا ہوں۔"

لیکن یہ خبر غلط نکلی اور جب آپ نے اپنی دکان کو محفوظ دیکھا تو اسی وقت دکان کا مال و اسباب عزیزوں اور محتاجوں میں تقسیم کر دیا اور خدا کی یاد میں محو ہو گئے۔ بغداد کے مشاہیر صوفیہ کی محفلوں کے سوا انہیں کہیں سکون نہ ملتا۔ حضرت داتا صاحبؒ کشف المحجوب میں فرماتے ہیں کہ ابتدا میں انہوں نے حضرت حبیب راعیؒ سے فیض حاصل کیا اور بعد میں حضرت معروف کرخی رحمۃ اللہ علیہ کے مرید ہو گئے۔ زہد و ورع میں ان کی شہرت بے داغ تھی اور تصوف کے تمام علوم پر کمال دسترس رکھتے تھے اور روحانی زندگی کے مقامات اور احوال پر اسلامی تصوف میں سب سے پہلے انہوں نے عالمانہ تحقیق کی اور عراق کے سینکڑوں صوفیہ ان کے حلقۂ ارشاد سے فیضیاب تھے، انہیں بغداد کے اربابِ توحید میں بلند مقام حاصل تھا۔ بغداد میں وہ پہلے صوفی رہنما تھے جنہوں نے تصوف کے ذریعے توحید کا درس دینا شروع کیا اور حقیقت کے علم کا فہم عام کیا چنانچہ سری سقطی رحمۃ اللہ علیہ جیسے بلند مرتبہ صوفی رہنما کی نگرانی میں حضرت جنیدؒ کا تصوف کی طرف رجحان ایک فطری عمل تھا اور خود حضرت جنید بغدادیؒ فرماتے ہیں کہ صوفیانہ طرزِ زندگی اور طرزِ فکر سے ان کا پہلا تعارف حضرت سقطیؒ کے گھر میں ہوا۔ جہاں وقت کے نامور صوفی توحید اور سلوک کی منزلوں کی تعلیم حاصل کرنے آتے تھے اور چوبیس گھنٹے علم و دانش کے چراغ جلتے تھے۔

حضرت سری سقطی رحمۃ اللہ علیہ جو علم توحید میں یکتائے روزگار تھے اپنے عزیز ترین

شاگرد اور بھانجے حضرت جنیدؒ پر خصوصی توجہ فرماتے۔ خود بھی فقہ اور حدیث پر سند تھے اور حضرت جنیدؒ کو جو علمی اور تعلیمی ماحول میسر تھا اس کا ان کی طبیعت اور مزاج پر گہرا اثر ہوا اور ان کے ذوقِ علمی کو زبردست جلا ملی۔ وہ ان بحثوں میں مسلسل شریک ہوتے جو اُن کے جید صوفی ماموں حضرت سری سقطیؒ کے مکان پر ہوتی تھیں اور حضرت جنیدؒ اس عہد کے صوفیائے کرام، علمائے دین اور اہلِ علم و دانش سے اچھی طرح واقف ہو گئے تھے اس کے علاوہ جب کوئی صاحبِ مقام و حال صوفی کبھی سری سقطیؒ کے ہاں آتا، حضرت جنیدؒ سے خاص طور پر تعارف کرایا جاتا اور بعض اوقات خصوصی محفلوں میں حضرت سری سقطیؒ اپنے بھانجے کو خاص طور پر شریک کرتے۔

حضرت جنیدؒ ابھی سات سال کے تھے اور ایک دن اپنے ماموں سری سقطیؒ کے قریب ہی کھیل رہے تھے، اس وقت کچھ لوگ ان کے ماموں سے شکر کے مسئلہ پر گفتگو کر رہے تھے۔ اچانک حضرت سری سقطیؒ نے اپنے بھانجے جنیدؒ سے پوچھا۔

”اے بیٹے! اللہ تعالیٰ کے شکر سے کیا مراد ہے؟“

حضرت جنیدؒ نے جواب دیا ”شکر یہ ہے کہ انسان اس خدا کی نافرمانی نہ کرے جو انسان پر بے بہا عنایتیں فرماتا ہے۔“

یہ سن کر حضرت سری سقطیؒ نے بے اختیار ہو کر کہا۔

”بہت ممکن ہے کہ خدا کی طرف سے تم پر جو عنایت ہوئی ہے وہ تمہاری زبان ہی ہو۔“

حضرت جنیدؒ نے ابتدا میں اپنے ماموں سری سقطیؒ سے فقہ اور حدیث کی تعلیم حاصل کی قرآنِ پاک حفظ کیا اور قرآنِ حکیم کی علمی تعلیم کے علاوہ درسِ تفسیر کا علم بھی انہوں نے اپنے ماموں سے حاصل کیا۔ اس کے ساتھ ساتھ تصوف پر اشاراتی اظہار و بیان کا شعور حاصل کیا اور سری سقطیؒ جو حضرت معروف کرخیؒ ایسے عظیم المرتبت کے حلقۂ ارشاد سے فیض یاب تھے حضرت جنیدؒ پر ان کے اثرات انتہائی گہرے تھے اور یوں حضرت معروف کرخیؒ کے بھی وہ بہت قریب تھے، جس کے نتیجے میں وہ ابتدا ہی سے حقیقتِ اُلوہیت پر غور و فکر میں گم رہنے لگے اور ابتداً ہی سے عبادات و دینی فرائض کی ادائیگی میں مصروف رہنے سے ان پر صوفیانہ کیفیت طاری رہتی تھی۔

حضرت سقطیؒ کا طریقۂ تعلیم بالکل مختلف تھا وہ حضرت جنیدؒ کے سامنے کوئی موضوع چھیڑ دیتے اس موضوع پر ابتدا میں گفتگو کرتے اور پھر حضرت جنیدؒ سے فرماتے کہ وہ اس موضوع پر سوال کریں۔ حضرت سری سقطیؒ ان سوالوں کے جواب دیتے اور اس طرح حضرت جنیدؒ اس بحث سے علم اخذ کرتے جو ان کی روح کا حصہ بن جاتا۔ ایک دن حضرت سری سقطیؒ نے حضرت جنیدؒ سے پوچھا:

”تمہارا محبت کے بارے میں کیا خیال ہے؟“

حضرت جنیدؒ نے فرمایا۔ کچھ کہتے ہیں کہ محبت جذبہ و احساس کے ایک ہو جانے کا نام ہے کچھ محبت کو دوسرے کو اپنی ذات پر ترجیح دینا کہتے ہیں۔ یہ سن کر حضرت سری سقطیؒ نے اپنے بازو کے گوشت کی چٹکی بھری جو اُن کی ہڈیوں پر اتنا خشک اور کسا ہوا تھا کہ وہ اسے کھینچ نہ سکے اور کہنے لگے۔ ”خدا کی قسم اگر میں یہ کہوں کہ میرا چمڑہ اللہ تعالیٰ کی محبت میں میری ہڈیوں پر سوکھ گیا ہے تو یہ غلط بات نہ ہوگی۔“

ایک اور دن حضرت جنیدؒ اپنے ماموں سقطیؒ کے پاس آئے تو وہ بہت گم سم اور گہرے غور و فکر میں ڈوبے ہوئے تھے۔ حضرت جنیدؒ نے اس کی وجہ پوچھی تو انہوں نے کہا۔ ”ایک نوجوان میرے پاس آیا اور توبہ کے متعلق پوچھنے لگا۔ میں نے اسے جواب دیا کہ توبہ کا مطلب یہ نہیں کہ تم اپنے گناہ بھول جاؤ۔“ تو اس نوجوان نے کہا کہ توبہ کے معنی تو یہ ہیں کہ انسان اپنے گناہوں کو بھول جائے۔“ یہ سن کر حضرت جنیدؒ نے کہا۔ ”جو کچھ اس نوجوان نے کہا ہے درست ہے۔“ حضرت سری سقطیؒ نے پوچھا۔ ”وہ کس طرح؟“ اس پر حضرت جنیدؒ نے کہا۔ ”جب ایک دفعہ کسی انسان کا تعلق اپنے رب کے ساتھ خراب ہو جاتا ہے اور اس کے بدلے وہ مقام دوبارہ حاصل ہو جاتا ہے تو اس وقت اپنی پہلی حالت کا دل میں خیال رکھنا اچھا نہیں ہے۔“

محققین کا خیال ہے کہ اُلوہیت، کائنات مخلوق اور روح کے موضوعات سے واقفیت حضرت جنیدؒ نے اپنے ماموں سری سقطیؒ سے بحث مباحثہ کے دوران حاصل کی یا ان محفلوں اور مذاکروں کے ذریعے جو ان کے گھر مشاہیر صوفیہ کی آمد سے منعقد ہوتے تھے۔ اس دوران حضرت جنیدؒ ریشم کی تجارت بھی کرتے رہے اور فقہ و حدیث میں اپنی تعلیم و تربیت مکمل کرنے کے لئے حضرت ابو ثورؒ سے بھی اکتسابِ علم کیا۔ اسی نسبت سے حضرت جنیدؒ کو ثوری بھی کہا جاتا ہے۔ حضرت ابو ثورؒ اپنے زمانے کے ممتاز قاضی اور فقیہہ تھے وہ فقیہانہ تشریحات و تعبیرات کی روایات سے پوری طرح آگاہ تھے اور فقہی تجزیہ کے فن میں اُن کا رویہ ترقی پسندانہ تھا چنانچہ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ اگر حضرت جنیدؒ تصوف کی طرف راغب نہ ہوتے تو بہت اعلیٰ پایہ کے قانون دان ہوتے۔ حضرت جنیدؒ جس وقت حضرت ابو ثورؒ سے فقہ کی تعلیم حاصل کر رہے تھے اُس وقت ان کی عمر بیس سال تھی اور فقہی مسائل پر اس وقت اُن کی مہارت اور پختگی کا بہت چرچا تھا۔ کیونکہ حضرت ابو ثورؒ پورے بلادِ اسلامیہ میں لا ریونیورسٹی کی حیثیت رکھتے تھے انہی کے حلقے کے فقیہانہ فیصلوں کو سرکاری و غیر سرکاری سطح پر درست تسلیم کیا جاتا تھا۔ اس نسبت سے عراق اور حجاز میں حضرت جنیدؒ کی فقیہانہ فہم و فراست کا تذکرہ شاندار لفظوں میں کیا جاتا تھا اور اُبھرتے ہوئے قانون دانوں میں انہیں ممتاز درجہ حاصل تھا۔ حضرت جنیدؒ کا یہ مکالمہ بھی اس کی تصدیق کرتا ہے ان کا ارشاد ہے کہ ”میں نے فقہ کی تعلیم ابو عبید اور ابو ثورؒ جیسے حدیث کے استادوں کے نظریہ کے مطابق حاصل کی اور بعد ازاں میں نے حارث المحاسبیؒ جیسے صوفیہ کی صحبت اختیار کی اور یہی چیز میری کامیابی کا راز بنی، اس لئے کہ ہمارا علم ہمیشہ قرآن و حدیث کے ضابطہ کے اندر رہنا چاہئے۔ جس شخص نے قرآن حفظ نہیں کیا اور نہ باقاعدہ طور پر حدیث پڑھی ہے اور تصوف کا رخ کرنے سے پہلے فقہ کا علم بھی حاصل نہیں کیا وہ ایک ایسا شخص ہے جسے رہنمائی کرنے کا کوئی حق نہیں۔“

چنانچہ حضرت جنید بغدادی رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت سری سقطیؒ کے بعد جس صوفی استاد کی صحبت اختیار کی، وہ حضرت حارث المحاسبیؒ ہیں۔ حضرت حارث المحاسبی اپنے وقت کے تمام اہلِ علم کے لئے عظمت کی نشانی تھے اور صوفیانہ اسرار و رموز پر کئی کتابیں تصنیف کر چکے تھے جو علمِ تصوف میں روشن چراغ ہیں اور حضورِ قلب کی کیفیات اور مقامات کی تفسیریں ہیں۔ بغداد کے علمی ادبی اور دینی اجتماعات میں انہیں خاص مقام حاصل تھا۔ حقیقتِ اُلوہی سے اتحاد کے تجربے سے آشنا تھے اور حضرت جنیدؒ کے ماموں حضرت سری سقطیؒ کے خاص دوستوں میں سے تھے۔ اکثر ان کے ہاں آتے اور کئی کئی دن قیام کرتے۔ علوم و فنون کی محفلیں سجتیں، ان محفلوں میں جن مسائل پر بصیرت افروز بحثیں ہوتیں وہ علم و آگاہی کا خزانہ ہوتیں اور عراق و حجاز کے اہلِ علم و دانش ان سے استفادہ کرتے۔ حضرت المحاسبیؒ کی تعلیمات اور حکیمانہ اقوال نے حضرت جنیدؒ پر گہرے اثرات چھوڑے، گھر پر آنے والے مشاہیر صوفیہ اور تصوف کے طلباء میں سے صرف حضرت المحاسبیؒ کے ساتھ حضرت جنیدؒ کی ذہنی وابستگی تھی۔ ایک دن حضرت المحاسبیؒ حسبِ معمول اپنے دوست حضرت سری سقطیؒ کے مکان پر آئے تو انہوں نے حضرت جنیدؒ سے کہیں باہر سیر کے لئے جانے کو کہا۔ حضرت جنیدؒ نے کہا کہ میں باہر گھومنے پھرنے کی بجائے خود کو اپنی تنہائیوں میں زیادہ پرسکون پاتا ہوں کیا آپ مجھے میری تنہائی سے باہر لا کر ایسے راستوں پر چلانا چاہتے ہیں جو خطرات سے بھری ہوئی ہے اور جس میں تو اس کو پراگندہ

کرنے والی چیزیں موجود ہیں۔"

حضرت المحاسبیؒ بھی حضرت جنیدؒ کی فراست اور غور و فکر کی صلاحیتوں سے بے پناہ متاثر تھے اور انہیں بے حد عزیز جانتے تھے۔ حضرت جنیدؒ سے کہنے لگے "گھبراؤ نہیں، میرے ساتھ چلو، باہر چلتے ہیں۔" حضرت جنیدؒ دوبارہ انکار نہ کر سکے اور ان کے ساتھ باہر آ کر ایک ایسے راستے چلنے لگے جو خالی اور ویران تھا انہیں اس راستے پر کوئی قابلِ اعتراض چیز نظر نہ آئی۔ حضرت جنیدؒ چلتے چلتے اس مقام پر آئے جہاں حضرت المحاسبیؒ اپنے خاص ساتھیوں اور عزیز ترین شاگردوں کے ساتھ مذاکرات کیا کرتے تھے۔ یہاں پہنچ کر حضرت المحاسبیؒ نے حضرت جنیدؒ سے کوئی سوال کرنے کو کہا لیکن حضرت جنیدؒ نے جواب دیا کہ وہ کوئی سوال نہیں کرنا چاہتے۔ حضرت المحاسبیؒ نے دوبارہ کہا کہ جو بھی سوال تمہارے ذہن میں آتا ہے کہہ دو۔ حضرت جنیدؒ کے ذہن میں اسی وقت سوالات امڈنے لگے۔ وہ سوال کرتے گئے اور ساتھ ساتھ حضرت المحاسبیؒ جو جوابات دیتے انہیں نوٹ کر لیتے۔

تذکرہ نویسوں نے حضرت جنیدؒ اور حضرت المحاسبیؒ کے درمیان تعلقات کو خصوصی اہمیت دی ہے۔ حضرت المحاسبیؒ حضرت جنیدؒ کو تنہائیوں سے باہر لانا چاہتے تھے اور حضرت جنیدؒ کو خلوت نشینی پسند تھی، ان کا استدلال تھا کہ انہیں غور و فکر کے لئے تنہائی کی ضرورت ہے لیکن حضرت المحاسبیؒ کی تحریک پر وہ مسجد میں لوگوں سے ملنے لگے۔ حضرت سری سقطیؒ کو معلوم ہوا تو انہوں نے حضرت جنیدؒ سے پوچھا "میں نے سنا ہے کہ مسجد میں تمہارے اردگرد لوگوں کا ہجوم ہوتا ہے۔"

حضرت جنیدؒ نے تسلیم کیا کہ وہ مسجد میں اپنے ہم خیال دوستوں اور ساتھیوں سے علمی اور تحقیقی بات چیت کرتے ہیں اور ایک دوسرے کے مطالعے و تجربے سے فائدہ اٹھاتے ہیں۔ یہ سن کر حضرت سری سقطیؒ نے کہا "میں دیکھ رہا ہوں کہ تم اپنا وقت عام لوگوں میں بسر کرتے ہو۔" اس واقعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت سری سقطیؒ کو یہ بات پسند نہ تھی کہ حضرت جنیدؒ جو ابھی تکمیل کے مرحلوں میں ہیں عام لوگوں سے میل جول رکھیں لیکن حضرت المحاسبیؒ کا خیال تھا کہ لوگوں سے ملنے جلنے میں کوئی حرج نہیں ہے اور حضرت جنیدؒ مسلسل یہی کہتے رہے کہ مجھے تنہائی میں ہی خوشی ہوتی ہے اور آپ مجھے زندگی کے ہجوم کے طوفانوں میں کھینچ رہے ہیں۔ حضرت المحاسبیؒ پھر بھی یہی کہتے "جنید! تم کب تک مجھے یہ سناتے رہو گے کہ تمہیں تنہائیاں ہی عزیز ہیں اور میری طرف دیکھو، اگر پوری انسانی آبادی کا نصف حصہ میرے پاس آ جائے تو پھر بھی مجھے ان کی قربت کی لذت کا احساس نہ ہوگا اور اس کا نصف حصہ مجھ سے دور بھی ہو جائے تو اس کی دوری کا مجھے احساس تک نہ ہوگا۔"

حضرت جنیدؒ کا لوگوں سے ملنے جلنے کو پسند نہ کرنا اور تنہائیوں میں رہنا یہ بھی ثابت کرتا ہے کہ وہ اپنے عقائد میں پختہ اور قلب و نظر کے بارے میں پُر اعتماد رہنے کے لئے تنہائی کو پسند کرتے تھے اور دوسری بڑی وجہ حالات کا ناساز گار اور پُر خطر ہونا تھا لیکن حضرت جنیدؒ حضرت المحاسبیؒ کی شخصیت، علم و تجربہ اور صوفیانہ مرتبے سے بے حد متاثر تھے اور ان کے درمیان استاد اور شاگرد کا تعلق بڑی تیزی سے استوار ہو رہا تھا۔

حضرت المحاسبیؒ کے حلقۂ ارشاد میں شریک ہونے والوں کی تعداد خاصی تھی اور وہ اسلامی علوم کے ثقہ استاد تھے۔ ان کا طریق تعلیم بھی بحث اور مذاکرے کی نوعیت کا تھا۔ شاگردوں کی طرف سے سوالات کئے جاتے جن کا وہ جواب دیتے وہ اس طریق تعلیم کو موثر اور فکر انگیز سمجھتے تھے۔ حضرت جنیدؒ ان بحثوں میں بڑے شوق سے شریک ہوتے تھے اور اس طرح تبادلۂ خیال سے وہ غور و فکر کی منزلیں طے کرتے رہے۔ حضرت المحاسبیؒ انسانی سلوک پر اپنے خصوصی انداز نظریات کی وجہ سے اس دور کے منفرد اساتذہ میں سے تھے۔ اخلاق کے معلم اور ابنائے نفسیات کے ماہر کی حیثیت سے ان کے اقوال کی شہرت دور دور تک تھی۔ اخلاقی پاکیزگی اور روح کی حفاظت ان کا خاص موضوع تھا۔ ہمعصر صوفیہ کی پُر از ابہام باتوں سے انہیں کوئی لگاؤ نہیں تھا اور اپنے شاگردوں کو اکثر تلقین کیا کرتے تھے کہ وہ اشارات کی تفسیر اور تعبیر میں احتیاط کا دامن ہرگز ہاتھ سے نہ چھوڑیں اور ایسے مسائل و نظریات کی کھلے بندوں تشہیر نہ کریں جو عام لوگوں کو عجیب و غریب محسوس ہوں۔ کیونکہ ان کے خطرناک نتائج نکل سکتے ہیں۔ حضرت المحاسبیؒ فرقۂ معتزلہ اور علم کلام کے ماننے والوں سے زبردست نظریاتی اختلاف رکھتے تھے۔ ان کیساتھ مسلسل مناظرہ کرنے اور اپنی کھلی تنقید سے وہ فرقۂ معتزلہ کے پُر زور مخالفین میں شمار ہوتے تھے۔

حضرت المحاسبیؒ اپنے عقائد و نظریات پر بڑی استقامت سے قائم تھے عام صوفیہ کی نسبت انتہائی اعلیٰ ذوقِ جمال رکھتے تھے اور ایک عالی شان گھر میں رہتے تھے جہاں زندگی کی ہر آسائش موجود تھی۔ ریشم پہنتے تھے اور ان کے گھر کی وسیع و عریض ڈیوڑھی میں ایک خوش رنگ پرندے کا پنجرہ تھا جو بعض اوقات گنگنانے لگتا تھا۔ ایک دن ابو حمزہؒ ان کے گھر آئے تو پرندے نے گانا شروع کر دیا۔ ابو حمزہؒ نے پرندے کو گاتے سنا تو اکدم بول اٹھے "یہ تو خدا ہے"۔ حضرت المحاسبیؒ یہ سنتے ہی طیش میں آ گئے اور انہوں نے چاقو نکالا اور ابو حمزہ سے کہنے لگے "اگر تم نے اپنے یہ الفاظ واپس نہ لئے تو میں تمہیں قتل کر دوں گا۔" ابو حمزہ نے جواب دیا "اگر تم میں یہ بات سننے کی تاب نہیں تو میں یہ سمجھنے سے قاصر ہوں کہ تم اتنے عالی شان مکان میں کیوں رہتے ہو۔ ریشم کیوں پہنتے ہو۔ اور کیوں نہیں جَو کی روٹی کھاتے اور عام لباس کیوں نہیں پہنتے۔" محققین کا خیال ہے کہ اس وقت حضرت المحاسبیؒ کا غصہ ابو حمزہ کے نزدیک اس بات کا ثبوت تھا کہ ابھی وہ صوفیانہ زندگی میں ادھورے ہیں اور آسائش و زیبائش کی زندگی بسر کرنا صرف ان صوفیا کا طریقہ ہے جو تکمیل کے تمام مراحل سے گذر چکے ہوں، روحانی بلندی کے اعلیٰ درجہ پر فائز ہوں اور جنہیں یہ خطرہ لاحق نہیں ہوتا کہ آسائش و زیبائش سے ان کی توجہ اپنے مرکز سے ہٹ جائے گی۔ حضرت المحاسبیؒ اور ابو حمزہؒ کے اس واقعہ کی تفصیل حضرت داتا گنج بخشؒ نے اپنی شہرۂ آفاق کتاب کشف المحجوب میں بیان کرتے ہوئے لکھا ہے کہ جب یہ واقعہ رونما ہوا ان کے تمام شاگرد بھی موجود تھے اور انہوں نے کہا "اے شیخ! یہ امر مسلمہ ہے کہ حضرت ابو حمزہؒ ایک صاحبِ مقام بزرگ اور موحد ہیں اس کے باوجود آپ نے انہیں شک کی نظر سے کیوں دیکھا۔" اس پر حضرت المحاسبیؒ نے کہا کہ میں ان پر شبہ نہیں کرتا ان کے خیالات و افکار بہت عمدہ اور حکمت افروز ہیں اور میں یہ بھی جانتا ہوں کہ وہ راسخ العقیدہ موحد ہیں لیکن انہیں ایسی بات منہ سے نہیں نکالنی چاہیئے تھی جس سے غلولیوں (حلول اور ارواح) کے نظریئے کی تصدیق ہوتی ہو۔ اور ظاہری طور پر تو ابو حمزہ کی بات حلولیوں کے عقیدہ پر مبنی نظر آتی ہے۔ اگر ایک غیر عاقل پرند عام پرندوں کے انداز میں سُر نکالتا ہے تو اس کے سُروں میں خدائے ذوالجلال کی آواز کیسے نکل سکتی ہے۔ "خدا ایک ناقابل تقسیم وجود ہے ایک ابدی چیز جو کسی صورت مجسم نہیں ہو سکتی اور نہ ہی مظاہر کے ساتھ متحد اور مخلوط ہو سکتی ہے۔"

ابو حمزہؒ نے بھی یہ مکالمہ سنا اور حضرت المحاسبیؒ کے نظریۂ معرفت کی صداقت نے انہیں یہ کہنے پر مجبور کر دیا کہ "اے شیخ! اگرچہ میرے نظریات میں کوئی کجی نہیں ہے اور چونکہ میری اس حرکت میں بدعتی اور غلط عقیدہ کے لوگوں سے مشابہت کا پہلو نکلتا ہے اس لئے میں شرمسار ہوں اور اپنے الفاظ واپس لیتا ہوں۔"

حضرت جنیدؒ بغدادی کو حضرت المحاسبیؒ کے جن رویوں نے متاثر کیا ان میں اس بات کو زیادہ اہمیت حاصل ہے کہ حضرت المحاسبیؒ علوم الٰہیات کے مستند استاد بھی تھے اور تصوف میں ان کا اندازِ فکر متوازن اور بہت ہی معتدل تھا وہ ان بے خود و سرشار صوفیہ سے ہرگز متفق نہ تھے جو جذباتی، ناقابلِ تعین اور آزاد خیال صوفیانہ اندازِ فکر رکھتے تھے اور روحانیت کی مستی میں موجودات و مظاہر میں خدا کے وجود کو دیکھتے تھے۔ حضرت المحاسبیؒ کا ذہن اور نقطۂ

بہت صاف تھا۔ وہ صرف خدائے قدوس کی طرف مکمل متوجہ ہونے کی تلقین کرتے تھے۔ وہ اخفا اور ابہام پر مبنی مسائل کو کبھی زیرِ بحث نہیں لاتے تھے اور صرف ان مسائل پر بحث کرتے تھے جو عقل و منطق کی حدود میں ہوں انہیں اسلام کے مروجہ اندازِ فکر کے فریم میں رہنا پسند تھا اور ان کے نزدیک خدا کا راز قرآن کے گہرے اور عمیق علم میں تھا۔ محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے قول و عمل سے اللہ تعالیٰ تک رسائی کا راستہ بتایا تھا اور اس سے اِدھر اُدھر ہونا تصوف میں غیر اصولی اختیار کرنے کے مترادف تھا۔

حضرت جنیدؒ نے حضرت المحاسبیؒ کی صحبت اسی لئے اختیار کی تھی کہ الٰہیات کے بارے میں اُن کے نظریات قرآن و سُنت پر مبنی تھے اور تصوف کی طرف مکمل طور پر حضرت جنیدؒ کے مائل ہونے کی وجہ بھی یہی تھی کہ حضرت المحاسبیؒ کی صحبت انہیں میسر تھی اور دقیق ترین مسائل پر ان کی اتنی گہری نظر تھی۔ حضرت جُنیدؒ جو عمر کے اس حصّے میں پہنچ چکے تھے جہاں فکر و نظر میں پختگی پیدا ہو جاتی ہے۔ اب ان کے لئے یہ ضروری ہو گیا تھا کہ وہ باہر نکلیں اور آگے بڑھیں کیونکہ شروع شروع میں وہ جب حضرت المحاسبیؒ کی محفلوں میں جانے لگے تو ایک دن یونہی سری سقطیؒ نے انہیں گھر سے باہر جاتے ہوئے دیکھا تو پوچھا۔

"جنیدؒ اب کس کی مجلس میں جانے کا ارادہ ہے؟"

حضرت جنیدؒ نے جواب دیا "حارث المحاسبیؒ کی محفل میں۔"

یہ سُن کر حضرت سری سقطیؒ نے فرمایا "ہاں جاؤ۔ اور اُس سے تعلیم و تربیت حاصل کرو لیکن کی نظری بحث و استدلال اور معتزلہ کے بارے میں اس کی جرح اور تردید سے آگاہ رہنا۔"

حضرت جنیدؒ نے کوئی جواب نہ دیا اور جب باہر جا رہے تھے تو حضرت سری سقطیؒ کو یہ کہتے ہوئے سنا "خدا کرے تم ایک صوفی محدث بنو، نہ کہ ایک محدث صوفی۔" صوفی محققین نے اس کا یہ مطلب بیان کیا ہے کہ حضرت سری سقطیؒ یہ چاہتے تھے کہ حضرت جنیدؒ سب سے پہلے حدیث و سنت کا علم حاصل کریں، اس کے بعد فقر و درویشی کی ریاضت کریں۔ تصوف کا فکری و نظری علم حاصل کریں اور باقاعدہ صوفی بن جائیں کیونکہ دین کے علم میں پوری طرح مہارت اور استحکام حاصل کئے بغیر تصوف کے مدارج طے کرنا ایک انتہائی خطرناک عمل ہے۔

حضرت المحاسبیؒ کی صحبت اختیار کرنے کے وقت حضرت جنیدؒ کی عمر تیس سال تھی اور تقریباً دس سال تک وہ حضرت المحاسبیؒ سے تعلیم و تربیت حاصل کرتے رہے اس دوران سری سقطیؒ سے ان کا مُرشد اور مرید کا تعلق ایک ایسی سطح پر استوار رہا جہاں ایک مرشد اپنی روحانی بصیرت سے اپنے روحانی شاگرد کے حال سے پوری طرح نہ صرف آگاہ ہوتا ہے بلکہ روحانی معاملات میں ہر لمحہ رہنمائی کر رہا ہوتا ہے۔ حضرت جنیدؒ علوم دین کی تعلیم و تربیت میں ایک سچے طالب علم کی طرح گم تھے۔ ہر لمحہ ان کا دھیان اللہ کی طرف رہتا تھا اور اسے پالینے کے ذوق و شوق کی بے پایاں مستیوں نے اپنے حصار میں لیا ہوا تھا چنانچہ انہیں علوم حاصل کرنے کا شوق تھا کیونکہ وہ جان گئے تھے کہ علوم کو جانے بغیر وہ اللہ تعالیٰ تک رسائی حاصل نہیں کر سکتے۔ اور حضرت معروف کرخیؒ کا یہ ارشاد ان کے ذہن کا حصہ بن چکا تھا کہ خدا کے اولیاء کی تین نشانیاں ہوتی ہیں ان کا خیال خدا کے حضور میں رہتا ہے، ان کا رہن سہن خدا کے ساتھ ہوتا ہے۔ ان کا سارا کاروبار بھی خدا کے ساتھ ہوتا ہے۔"

حضرت جنیدؒ بغدادی کے شاگردوں کی تحریروں سے پتا چلتا ہے کہ وہ دینی شعائر کی سختی سے پابندی کرتے تھے، ہر وقت باوضو رہتے تھے، پانچوں وقت کی نماز باجماعت ادا کرتے تھے اور ان کی ساری رات عبادت میں گذرتی تھی۔ ان کی روزی کا وسیلہ سوداگری تھا۔ ریشم کی تجارت کا ایک خودکار نظام قائم ہو چکا تھا جہاں سے اتنا سرمایہ مل جاتا تھا کہ اُن کی گذر بسر آسانی سے ہو جاتی تھی اور اس سرمائے کا بڑا حصہ دوستوں کی خاطر مدارات پر خرچ کر دیتے تھے کیونکہ ان کا ذاتی مکان بھی تھا جہاں ہر وقت دوسرے شہروں اور ملکوں سے آنے والے صوفی طالب علم بلا تکلف قیام کرتے تھے اور ان کے طعام و قیام کی ذمہ داری حضرت جنیدؒ نے قبول کی ہوئی تھی۔ اس کے علاوہ اپنا روپیہ پیسہ غریب اور مفلوک الحال صوفیہ کی اعانت پر بھی خرچ کرتے تھے عبادت الٰہی اور زہد و ورع میں وہ بے حد متوازن تھے۔ بے پناہ مشقت بھی کرتے تھے اور کھانے پینے کے معاملے میں بہت سادہ تھے۔ صرف اتنا کھاتے کہ جس سے جسم و جان کا رشتہ برقرار رہ سکے۔ ان کے ملنے جُلنے والوں میں سیاست دان بھی تھے لیکن سیاست سے انہیں کوئی دلچسپی نہ تھی۔ اپنے احباب میں انہیں بے حد قدر و منزلت حاصل تھی۔ اُن کی نگاہ آخری حدوں تک دیکھتی تھی۔ معاملہ فہمی میں ان کے کمال کا عالم یہ تھا کہ پیچیدہ سے پیچیدہ مسئلے کی تہہ تک پہنچ جاتے تھے اور ہر مسئلہ کا قابلِ قبول حل فوراً بتا دیتے تھے۔

جہاں تک ان کی ازدواجی زندگی کا تعلق ہے اس سلسلے میں کوئی ایسی شہادت نہیں ملتی کہ انہوں نے کسی سے شادی کی اور ان کی اولاد بھی تھی یا نہیں، چنانچہ یہ ثابت ہوتا ہے کہ انہوں نے عمر بھر شادی نہ کی اور مجرد زندگی بسر کی۔ کیونکہ صوفی اساتذہ کے ارشاد کے مطابق طریقت کی بنیاد مجرد رہنے پر رکھی گئی ہے۔ حضرت جنیدؒ کی ایک وفادار ملازمہ کا ذکر ملتا ہے جس نے ان کی اور دوسرے صوفیہ کی خدمت کی ہے اس دوران انہوں نے بغداد ہی میں اپنا وقت گذارا جبکہ دوسرے صوفیہ سیر و سیاحت پر رہتے تھے۔ صرف ایک بار حج کرنے گئے۔ ایک تو وہ صوفیانہ طرزِ زندگی میں بے حد مصروف تھے اور دوسرے ان کا یہ پختہ نظریہ تھا کہ حج کا سفر روحانی سطح پر ہونا چاہئے۔ ایک مرتبہ اُن کے پاس ایک شخص آیا اور اس نے بتایا کہ وہ حج کر کے آیا ہے۔ حضرت جنیدؒ نے پوچھا "اس وقت سے جب تم نے حج کے لئے گھر کو خیر باد کہا کیا تم نے تمام گناہوں کو بھی خیر باد کہا تھا یا نہیں؟"

"نہیں! ایسا تو نہیں ہوا۔" اس شخص نے جواب دیا۔

"پھر تم نے کیا حج کیا! اچھا یہ بتاؤ کہ اس سفر کے دوران تم نے جس منزل پر پڑاؤ کیا، کیا اس موقع پر تم نے اللہ تعالیٰ کی طرف بھی کوئی منزل طے کی؟"

"نہیں!"

"پھر تم نے راہِ حج کا سفر منزل بمنزل تو نہ کیا۔ اچھا یہ بتاؤ کہ جب تم نے مقامِ معین پر احرام باندھا تو کیا تم نے اپنی ذات سے عام انسانی صفات کا جامہ بھی اسی طرح اتار پھینکا تھا جس طرح تم نے اپنا دنیوی لباس اپنے جسم سے اتارا تھا؟"

"نہیں۔"

"پھر تم نے احرام کہاں باندھا؟ اچھا یہ بتاؤ کہ جب تم نے مقامِ عرفات میں قیام کیا تو کیا تم نے ایک لمحہ بھی خدا کے کامل دھیان میں گذارا؟"

"نہیں۔"

"پھر تم نے عرفات کا قیام کہاں کیا؟ اور یہ بتاؤ کہ جب تم مزدلفہ گئے اور اپنی دلی مراد پائی تو کیا تم نے خانۂ کعبہ میں جمالِ خداوندی کا مشاہدہ کیا؟"

"نہیں۔"

"تو پھر تم نے درحقیقت کعبہ کا طواف ہی نہیں کیا اور یہ بتاؤ کہ جب تم نے صفا اور مروہ کے درمیان سعی کی تو کیا تم نے صفا (پاکیزگی) اور مروت (نیکی) کا مقام حاصل کیا؟"

"نہیں۔"

"تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ تم نے سعی نہیں کی۔ اچھا یہ بتاؤ کہ جب تم منیٰ میں آئے تو کیا تمہاری تمام خواہشیں ختم ہو گئیں؟"

"نہیں۔"

"تو پھر تم منیٰ کہاں گئے۔ اور یہ بھی بتاؤ کہ جب تم مقامِ ذبح پر گئے اور قربانی ادا کی تو کیا تم نے خواہشاتِ جسمانی کی تمام صورتوں کی قربانی دی؟"

"نہیں۔"

"پھر تم نے کوئی قربانی نہیں دی اور یہ بتاؤ کہ جب تم نے کنکریاں پھینکنے کا عمل کیا تو جتنے دنیوی خیالات تم سے چمٹے ہوئے تھے کیا تم نے ان سب کو اپنے آپ سے الگ کر کے پھینکا؟"

"نہیں۔"

"پھر تم نے کنکریاں نہیں پھینکیں اور حج کے شعائر ادا نہیں کئے لہٰذا واپس جاؤ اور اس طریقے پر حج کرو جس طریقے پر میں نے تمہیں بتایا ہے تاکہ تم مقامِ ابراہیمؑ تک پہنچ سکو۔"

(کشف المحجوب)

حضرت جنید بغدادی رحمۃ اللہ علیہ جن کے بارے میں یہ بھی کہا جاتا ہے کہ صوفیانہ تکمیل تک وہ حضرت المحاسبیؒ ہی کے پاس تھے اسی دوران انہیں ظاہری و باطنی علوم میں دسترس حاصل ہوئی اور انہی علوم کی روشنی میں انہوں نے کمال جرأت سے دنیائے تصوف میں قدم رکھا تو منزلیں اپنے آپ طے ہونے لگیں۔ تذکرہ نویس لکھتے ہیں کہ وہ ہر لمحہ ایک سرمدی کیفیت میں رہتے تھے صوفیانہ زندگی کے ہر تجربے سے گذرے اور معرفتِ الٰہی میں آگے ہی بڑھتے گئے اکثر و بیشتر باہر جنگلوں میں رہتے اور اللہ تعالیٰ کے مشاہدے میں اتنے دور چلے گئے کہ کا کسی چیز سے کوئی تعلق نہ رہا اور خدا سے تعلق کی لذتیں ان پر واضح ہوتی چلی گئیں۔ وہ ایک ایسے عاشق کی اذیت میں کھو گئے جسے محبوب کی جدائی کہیں چین نہیں لینے دیتی۔ جستجوئے حق میں عقل و فکر سے کنارہ کش ہو کر ایک روحانی سوز و گداز ہی ان کا سرمایہ تھا اور آنسوؤں بھری آنکھوں سے اپنے خالق کی تلاش میں ہر اس مرحلے سے گذرے جو صوفیانہ نکتۂ نظر کے مطابق ایک سچے خدا دوست سے حضرت جنیدؒ کے الفاظ میں یہ تقاضا کرتا ہے کہ تمام ماسوا اور مانوس لبیروں اور بھائی بندوں سے تعلق کو ایسے ختم کر دیا جائے جیسے تھا ہی نہیں۔ چالیس سال کی عمر تک حضرت جنیدؒ صوفیانہ ابتلاء و آزمائش میں رہے کہا جاتا ہے کہ صوفیانہ عمل کا زیادہ عرصہ انہوں نے جنگل و بیابان میں گذارا۔ اس کی تصدیق کشف المحجوب سے بھی ہوتی ہے جس میں حضرت داتا صاحبؒ نے حال اور وقت کی صوفیانہ اصطلاح کے حقیقی معنی بیان کرتے ہوئے حضرت جنیدؒ کا ایک واقعہ حوالے کے طور پر ان الفاظ میں پیش کیا ہے کہ ایک دن حضرت جنیدؒ جنگل میں سے گذر رہے تھے کہ انہوں نے ایک درویش کو کیکر کے درخت کے نیچے سخت اور تکلیف دہ جگہ پر بڑی مشکل سے بیٹھے دیکھا۔ حضرت جنیدؒ کے قدم رک گئے اور پوچھا کیوں بھائی! تم یہاں کس لئے بیٹھے ہو جبکہ یہ جگہ اتنی سخت ہے کہ کوئی یہاں لمحہ بھر کے لئے نہیں بیٹھ سکتا۔ اور تم یہاں جم کر بیٹھے ہو۔ اس درویش نے جواب دیا کہ "میرا ایک وقت تھا جو یہاں اس جگہ کھو گیا ہے اور اب میں اسی کے غم میں یہاں بیٹھا ہوں۔" حضرت جنیدؒ نے پوچھا: "مگر تم کتنے عرصہ سے یہاں بیٹھے ہوئے ہو؟"

اس نے کہا: "بارہ سال گذر گئے ہیں اور اب مرشد کو چاہیئے کہ مجھ پر مہربانی کرے تاکہ مری مراد پوری ہو جائے اور میرا وقت مجھے مل جائے۔"

حضرت جنیدؒ جب حج پر گئے تو وہاں انہوں نے اس درویش کے لئے دعا کی اور اس درویش کو منزل مل گئی۔ حضرت جنیدؒ حج پر سے واپس آئے اور اسی جنگل میں ایک روز پھر ان کا گذر ہوا تو وہ درویش اسی جگہ بیٹھا ہوا تھا۔ حضرت جنیدؒ نے اس سے کہا کہ "اے بہادر انسان! اب جب کہ تمہیں تمہارا کھویا ہوا وقت مل گیا ہے تو پھر کیوں اسی جگہ پر بیٹھے ہو؟"

اس نے کہا کہ "اے مرشد! یہ وہ جگہ ہے جہاں مجھے وحشت اور پریشانی لاحق ہوتی تھی اور میرا سرمایہ گم گیا تھا اور اب بھی یہی وہ جگہ ہے جہاں مجھے میرا گمشدہ سرمایہ ملا ہے میں نے اس جگہ کو پکڑ لیا ہے اس جگہ سے محبت ہو گئی ہے اور اب یہ جائز نہیں کہ میں اس جگہ کو چھوڑ کر کسی دوسری جگہ پر چلا جاؤں۔ میری تو تمنا ہی یہی ہے کہ میری مٹی بھی اسی جگہ مل جائے اور قیامت کے دن جب میں اٹھایا جاؤں تو اسی جگہ سے اٹھایا جاؤں۔ یہ میرے عشق کی جگہ ہے۔"

حضرت جنیدؒ کے ماموں اور مرشد حضرت سری سقطیؒ اپنے باکمال بھانجے کے مرتبے سے بخوبی آگاہ تھے اور ان کے ہر حال سے باخبر تھے اس کے علاوہ بغداد کے روحانی مرشدوں اور روحانیت کے طالب علموں کے ساتھ ساتھ سیاسی، ادبی اور سماجی حلقوں میں ان کی شخصیت انتہائی بلند قامت سمجھی جاتی تھی۔ جب وہ تکمیلِ معرفت کے مقام پر فائز ہوئے تو ان کے علم و تجربے کی دھوم مچ گئی اور دور و نزدیک میں بغداد کا نام پہلے سے زیادہ اس لئے باعزت ہو گیا کہ وہاں حضرت جنیدؒ رہتے تھے۔ ان کے مرشد ان پر فخر کرتے تھے، دوست ان پے نسبت پر نثار تھے اور عقیدت مندوں کے لئے ان کا وجود باطنی روشنی کی علامت تھا۔ وہ جس جگہ بیٹھتے باعظمت ہو جاتی اور جو کچھ کہہ دیتے علم بن کر پھیل جاتا۔ زمانہ ان کی اعالی فکر کی رفعت و برتری کا قائل تھا۔ تصوف میں انہیں مستند صاحب ارشاد تسلیم کرنے میں کسی نے تامل نہ کیا شریعت و طریقت کے علوم کے بارے میں ان کے فکر و عمل اور آراء کو اتنی اہمیت حاصل ہو گئی کہ بغداد کے تمام روحانی مرشدوں نے ان سے التجا کی کہ وہ رشد و ہدایت کی مسند قبول کریں لیکن حضرت جنیدؒ نے جواب دیا کہ جب تک میرے مرشد دنیا میں موجود ہیں میں مسندِ ارشاد قبول نہیں کر سکتا اور یہ ہو نہیں سکتا کہ ایک مرید کا رتبہ اس کے مرشد روحانی سے بلند ہو جائے۔ انہی دنوں یہی مسئلہ حضرت سری سقطیؒ کی محفل میں بھی اٹھایا گیا۔ جب ایک شخص نے یہ پوچھا کہ کیا ایک مرید کا مرتبہ اس کے روحانی مرشد سے بلند ہو سکتا ہے؟ حضرت سری سقطیؒ نے کہا۔

"ہاں ایسا ہو سکتا ہے اور اس کا واضح ثبوت یہ ہے کہ جنیدؒ کا مرتبہ مجھ سے بلند ہے۔"

یہ بات جنیدؒ تک بھی پہنچی اور اسی رات انہیں خواب میں ہادیٔ اعظم محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت ہوئی اور رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"اے جنیدؒ! لوگوں کو کچھ بتاؤ۔ اس لئے کہ خدا نے تمہاری زبان کو انسان کی نجات کا ذریعہ بنایا ہے۔" حضرت جنیدؒ بیدار ہوئے تو ان کے دل میں یہ گمان ہوا کہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے اس لئے اظہار کا حکم فرمایا ہے کہ میرا مرتبہ واقعی میرے مرشد سے بلند ہے۔ صبح ہوئی تو سب سے پہلے جو شخص انہیں ملا وہ حضرت سقطیؒ کا قاصد تھا جس نے یہ پیغام دیا۔

"جنیدؒ! تم سے جب تمہارے مریدوں نے درس و وعظ کرنے کی التجا کی تو تم نے انکار کر دیا۔ اس کے بعد بغداد میں موجود مرشدوں کی بات بھی نہ مانی اور نہ ہی تم نے میری درخواست قبول کی لیکن اب تمہیں خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حکم دیا ہے تو اس معاملے میں میں تمہیں خبردار کرتا ہوں کہ اس حکم سے روگردانی نہ کرنا اور پورے خلوص سے اس کی تکمیل کا فرض ادا کرنا۔"

یہ پیغام سن کر حضرت جنیدؒ کے دل سے مرید کے مرشد کے مرتبہ سے بلند ہونے کا خیال فوراً ہی مٹ گیا اور انہیں اس بات کا یقین بھی تھا کہ حضرت سری سقطیؒ ان کے تمام ظاہری و باطنی حالات سے آگاہ رہتے ہیں۔ لیکن اس واقعہ سے ان کے دل میں اپنے مرشد حضرت سری سقطیؒ کی روحانی عظمت کی روشنی ہی روشنی پھیل گئی اور محسوس کیا کہ مرشد کا مرتبہ اس لئے مجھ سے بلند ہے کہ وہ میرے باطنی امور سے بھی آگاہ ہیں لیکن میں ان کے باطنی امور سے آگاہ نہیں ہوں۔ حضرت جنیدؒ اسی لمحے اپنے ماموں کے گھر گئے اور انتہائی تعظیم و تکریم کے ساتھ ایک بے پناہ محبت کرنے والے مرید کی طرح پوچھا۔

"آپ کو کیسے میرے اس خواب کا علم ہوا ہے جس میں میں نے رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم

کر دیکھا ہے۔"

حضرت سری سقطیؒ نے کمال بیمانہ شفقت کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔

"میں نے خواب میں اللہ تعالیٰ کو دیکھا ہے وہ فرماتے تھے میں نے اپنے رسولؐ کو جنیدؒ کے پاس بھیجا ہے کہ وہ جنیدؒ سے درس و وعظ کا کہے۔"

حضرت جنیدؒ جب وہاں سے باہر آئے تو وہ اس بات پر بے پایاں نازاں تھے کہ انہیں حضرت سری سقطیؒ جیسا عظیم مرشد ملا ہے اور اس عظیم عطیے پر اظہار تشکر کے لئے ان کا سر خدائے قدوس کے حضور ایسا سرنگوں ہوا کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت جنیدؒ کو روحانی زندگی کی اعلیٰ ترین رفعتوں سے سرفراز فرما دیا۔ حضرت جنیدؒ نے درس و وعظ کا آغاز کیا تو پوری دنیائے تصوف میں انقلاب آگیا اور ایک ایسا نظام افکار وجود میں آنے لگا جسے اس عہد کے تمام اہل علم و دانش نے ایک تحریک کی صورت میں اپنایا اور ذاتِ باری اور زمان و مکان کے اسرار کے اس علم کے سوتے پھوٹ نکلے جو قرآن پاک اور سنتِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میں پوشیدہ ہے جب تک حضرت سری سقطیؒ اس دنیا میں موجود رہے حضرت جنیدؒ ان سے ہر حال میں وابستہ رہے۔ مرشد اور مرید کے درمیان جو تعلق تھا وہ اظہار و بیان میں نہیں آسکتا یہ ان مقامات کا تعلق تھا جہاں محبت اکائی بن جاتی ہے غیریت اور دُوری کا احساس ختم ہو جاتا ہے کہتے ہیں جب حضرت سری سقطیؒ دنیا سے رخصت ہونے لگے تو حضرت جنیدؒ اس موقع پر موجود تھے۔ مرشد نے مرید سے کہا۔

"اب جدا ہوتے ہیں۔"

حضرت جنیدؒ نے کہا "مرشد! آپ کے اس دنیا سے جانے کے بعد آپ جیسا دوسرا کہیں بھی نظر نہیں آئے گا۔"

سری سقطیؒ نے کہا "ایسا نہ کہو۔ کیونکہ لوگ تم سا بامروت اور کریم النفس بھی اس دنیا میں کہیں نہ پائیں گے۔"

حضرت سری سقطیؒ نے تیسری صدی ہجری میں اسلامی تصوف کے جن ضابطوں کی تخلیق کی۔ ان کے وصال کے بعد حضرت جنیدؒ نے اسے ایک باقاعدہ مکتب کی شکل دی اور جب وہ مسندِ ارشاد پر فائز ہوئے تو انہیں بیک وقت تصوف کے کئی ایک نظریاتی اداروں کا سامنا کرنا پڑا۔ ان کے زمانۂ ارشاد و وعظ کے آغاز سے قبل ہی صوفیانہ بدعتیں اپنے عروج پر تھیں۔ ایمان اور معرفت کے الگ الگ تصوّر مقبولیت کی انتہا پر تھے۔ باطنی فرقہ قرامطی شریعت کی نفی میں خطرناک معاملات تک جا پہنچا تھا۔ اہل علم کلام اپنی فضیلت کو بڑے کروفر سے ثابت کرتے تھے اور توحید کے قرآنی تصور کی جگہ ایک ایسا تصورِ توحید پرورش پا رہا تھا جس میں عقل کو بنیادی اہمیت حاصل تھی اور وجدانی معرفت کی بجائے عقلی معرفت پر زور دیا جاتا تھا۔ صوفیہ میں رہبانیت سرایت کر رہی تھی۔ خدا سے محبت اور عشق کے نظریئے کے خلاف ایک طاقتور گروہ کو حکمران طبقہ کی حمایت حاصل تھی اور حکمران طبقہ شریعت کے محافظ کی حیثیت سے ان دینی معاملات میں دخل دینے اور احتساب کرنے کا خود کو مجاز سمجھتا تھا جو عوام کی اکثریت کو ناپسند تھے اس طرح بعض صوفیانہ بدعتوں کے باعث حکمران طبقے اور عوام میں سب کے سب صوفیہ کے بارے میں ناپسندیدگی کا رجحان عام تھا۔ محققین نے حضرت جنیدؒ کے زمانہ میں وعظ و ارشاد کو صوفیہ کے لئے عتاب کا زمانہ کہا ہے۔ جبکہ مجردانہ زندگی اختیار کرنے کے نظریات اور عمل میں ابہام کے پیدا ہو جانے سے تصوف سراسر بدعت قرار دیا جا رہا تھا اور اس قسم کی وحدت الوجودیت شرعی اور قانونی اسلام کے حامیوں کے لئے بہت بڑا چیلنج بنی ہوئی تھی۔ چنانچہ عوامی احساس اور عمل کے ایسے شعور کے تحت حضرت جنیدؒ نے ایک صحیح راستے کی نشاندہی کے لئے اپنی ہمتوں کے پرچم بلند کئے اور وعظ و ارشاد میں محتاط روّیوں اور اپنی گوشہ نشینی کے طریقے سے انہوں نے امن و سلامتی کا ایک ایسا ماحول تخلیق کیا اور کہا۔

"امن و سلامتی تو صرف ان لوگوں کو نصیب ہوتی ہے جو سوچ سمجھ کر اس کی تلاش کرتے ہیں۔ خواہ مخواہ مخالفت کی تردید میں ہی بہہ نہیں جاتے اور ان چیزوں کی خواہش کی پیروی نہیں کرتے جو اسلام میں ممنوع ہیں۔"

حضرت جنیدؒ نے جن کا یہ عقیدہ علمی سطح پر بے حد مقبول ہوا کہ معرفت الٰہی کے رازوں کو ظاہر کرنا ایک غلط اور مذموم عمل ہے اور القاء و الہام کے اندر جو راز ہے اگر اسے ظاہر کر دیا جائے تو علم کا وجود ختم ہو جاتا ہے۔" حضرت جنیدؒ نے اپنے شاگردوں اور طالب علموں کا ایک مختصر گروہ منتخب کیا جس کی تعداد بیس سے زیادہ نہ تھی اور ان کے انتخاب کا معیار بہت کڑا تھا وہ خاص حلقۂ ارشاد میں معرفتِ الٰہی کی تعلیم دیتے تھے۔ وہ اپنے شاگردوں اور دوستوں سے اکثر کہا کرتے تھے کہ تصوف دراصل ذاتِ باری ہی کا راز ہے اور اس کی تعلیم بھی راز دارانہ ہونی چاہیئے کیونکہ عام ہو جانے سے یہ خطرناک ثابت ہو سکتی ہے۔ اپنے مرشد حضرت سری سقطیؒ اور استاد حضرت المحاسبیؒ کی طرح ان کا طریقۂ تعلیم بھی بحث و مذاکرہ پر مبنی تھا وہ شاگردوں اور طالب علموں کے ساتھ مسائل اور موضوعات پر بحث کرتے، ان کے سوالوں کے جواب دیتے جنہیں بعد میں ان کے شاگرد نوٹ کر لیتے۔ جو لوگ انہیں دوسرے شہروں اور ملکوں سے بعض مسائل پر خط و کتابت کرتے۔ ان کا جواب تحریری صورت میں دیتے۔ ویسے اس دور میں صوفیائے کرام خفیہ تعلیم ہی دیتے تھے اور انہوں نے ایک راز دارانہ اور اشارتی اسلوب تخلیق کیا ہوا تھا۔ حضرت جنیدؒ کا حلقہ ارشاد نہ صرف ان کے شاگردوں تک محدود تھا بلکہ ان کے ہمعصر صوفیہ اور اہلِ دانش بھی ان کی محفل میں آتے تھے اور علوم و فنون پر ان کے نقطۂ نظر سے رہنمائی حاصل کرتے تھے۔ ان کے ایک شافعی المذہب دوست اور قانون کے ماہر ابنِ سُریج نے ایک دفعہ کسی محفل میں کسی موضوع پر موثر انداز میں خیالات کا اظہار کیا تو سننے والوں نے کہا۔

"ابنِ سریج! یہ خیالات تم نے کہاں سے حاصل کئے ہیں؟"

ابنِ سریج نے جواب دیا "میرے ان خیالات کا منبع حضرت جنیدؒ کی شخصیت اور سیرت ہے اور یہ سب کچھ مجھے ان کی صحبتوں سے حاصل ہوا ہے۔"

ابنِ سریج اگرچہ حضرت جنیدؒ کے دوست تھے لیکن ہمیشہ شاگردوں کے سے انداز میں ان کے حلقہ ارشاد میں آتے اور ان کے اقوال و افکار سے فیض یاب ہوتے۔ ایک دن حضرت جنیدؒ نے کسی مسئلہ پر اظہارِ خیال تو ابنِ سریج نے کہا۔

"اے جنیدؒ! یہ حقیقت ہے کہ میں اس سے پیشتر نہیں جانتا تھا کہ ان سوالوں کا جواب کیا ہو سکتا ہے۔" حضرت جنیدؒ نے جواب دیا۔

"یہ میں بھی نہیں جانتا تھا لیکن اللہ تعالیٰ نے یہ الفاظ میری زبان سے ادا کرا دیئے۔ یہ کلمات نہ تو کتابوں سے اخذ کئے جاتے ہیں اور نہ مطالعہ سے یہ خیالات سراسر خدا کا عطیہ ہیں۔" ابنِ سریج نے حیرت زدہ ہو کر پوچھا۔

"مگر یہ بصیرت تمہیں کیسے حاصل ہوئی؟"

حضرت جنیدؒ نے جواب دیا "ابن سریج! یہ اللہ تعالیٰ سے چالیس سال تک تعلق رکھنے کا نتیجہ ہے۔"

اس زمانے کے ایک اور مرشد حضرت ابنِ کُلّابؒ جنہوں نے اپنے زمانے کے تمام فرقوں کی تردید میں تصنیف و تالیف کا سلسلہ شروع کیا تو انہوں نے اپنے شاگردوں اور دوستوں سے پوچھا "میں نے تمام فرقوں پر اپنا تحقیقی کام مکمل کر لیا ہے لیکن ایسا کوئی اور بھی فرقہ ہے جو میری نظر سے رہ گیا ہو؟"

جو صوفیا، یہاں صوفیہ کا فرقہ رہ گیا ہے۔

"مگر ان کا رہنما کون ہے؟" حضرت کلابؒ نے پوچھا۔

لوگوں نے کہا: "ان کے رہنما حضرت جنیدؒ ہیں۔"

دوسرے دن حضرت ابنِ کلابؒ اپنے شاگردوں سمیت حضرت جنیدؒ کی قیام گاہ پر گئے اور ان کے عقائد کے بارے میں کئی ایک سوالات پوچھے۔ حضرت جنیدؒ نے ان سب کے جواب میں ایک ہی جملہ کہا۔ "ہمارا اصول اور نظریہ اس حقیقت پر مبنی ہے کہ ازلی و غیر فانی کو اس چیز سے الگ کر دیا جائے جس کی تخلیق کا وقت اور زمانے کے ساتھ تعلق ہے اس کے علاوہ اپنے ہمجنسوں اور بھائیوں، وطنوں اور گھروں سے تعلق ختم کر لیا جائے اور ماضی و حال کے خیال کو دل سے نکال دیا جائے۔"

ابنِ کلابؒ یہ سن کر حیران رہ گئے اور کہنے لگے۔

"یہ ایسی حقیقت ہے جسے ہم منطقی اصولوں کے تحت موضوعِ بحث نہیں بنا سکتے۔"

ابنِ کلابؒ جنہیں منطق و استدلال میں بے پناہ دسترس حاصل تھی، سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر حضرت جنیدؒ کے حلقۂ ارشاد سے منسلک ہو گئے۔ اور درس لینے لگے۔ نظریہ توحید جس کے بارے میں ابنِ کلابؒ کا خیال تھا کہ اس کی وضاحت مشکل ہے حضرت جنیدؒ سے اس کا فہم حاصل کرنے کے لئے اسی موضوع پر سوال کرتا اور حکمت و اسرار سے مالا مال ہونے لگا۔ ایک دن کسی فقرے پر ابنِ کلاب نے اسے دوبارہ دہرانے کی درخواست کی لیکن حضرت جنیدؒ نے اس کے آگے کی بات جاری رکھی جو از خود تشریح طلب تھی۔ کلاب نے اس کی بھی تشریح کی خواہش کا اظہار کیا تو حضرت جنیدؒ نے کہا۔

"اگر یہ الفاظ میں نے کہے ہوتے تو یقیناً انہیں قلمبند بھی کروا دیتا۔"

ابنِ کلاب خاموش ہو گیا اور اسے قائل ہونا پڑا کہ حضرت جنیدؒ الہامی باتیں کہتے ہیں:

حضرت جنیدؒ کے ایک شاگرد خلدی کا کہنا ہے کہ ہمارے مرشد کے سوا ہمیں کسی دوسرے ایسے مرشد کا علم نہیں جس کی ذات میں علم اور تجربہ دونوں جمع ہو گئے ہوں۔ بہت سارے مرشدوں کے پاس علم تو ہے لیکن تجربہ نہیں ہے اور کچھ ایسے بھی ہیں جن کے ہاں تجربہ تو ہے لیکن علم بہت کم ہے۔"

اُن سے بعض اوقات کچھ ایسے بھی صوفیانہ رموز کے سوال پوچھے جاتے جو کبھی کسی نے نہیں پوچھے تھے اور وہ ان کے اسرار سے آگاہ ہونے اور ان کی حقیقت جاننے کے لئے اٹھ کر اندر چلے جاتے اور اللہ کی طرف رجوع ہو کر غور و فکر کی گہرائیوں میں اتر جاتے تھوڑی دیر بعد آتے تو سوال کرنے والے کو وہ چیز بتا دیتے جس کا انہوں نے تجربہ کیا ہوتا۔ حضرت جنیدؒ کے ہمعصر اساتذہ کا کہنا ہے کہ وہ اپنی صحبت میں ہر آنے والے کے حال، مزاج اور طبیعت سے واقف ہوتے تھے اور ان کے ظرف کے مطابق ان کو اسرار سے آگاہ کرتے تھے۔ حضرت نوریؒ لکھتے ہیں کہ میں ایک دن حضرت جنیدؒ کے حلقۂ ارشاد میں گیا تو وہ مسندِ ارشاد پر رونق افروز تھے اور شاگرد قلب و نظر کی سچائیوں کے ساتھ ہمہ تن گوش تھے۔ اور ساری فضا باعظمت نظر آتی تھی۔ مجھ سے نہ رہا گیا اور میں نے کہا: "اے جنیدؒ تم نے لوگوں سے حقیقت کو چھپا رکھا ہے اور انہوں نے تمہیں عزت و توقیر کا مقام دیا ہے، میں نے ان پر حقیقت ظاہر کر دی تو انہوں نے مجھے پتھر مارے۔"

حضرت نوریؒ کے اس تحسین آفرین جملے سے محققین نے یہ اخذ کیا ہے کہ حضرت جنیدؒ پر حق و باطل پوری طرح عیاں تھا اور سارے علوم ان پر واضح ہونے کے باوجود سرمست و بے خود نہیں تھے، انہوں نے صوفیانہ سرمستی و بے خودی پر زبردست کنٹرول حاصل کیا ہوا تھا اور اس ہوش کی مسند پر متمکن تھے کہ انہیں معلوم تھا کہ انہوں نے کس کو کیا کہنا ہے۔ وہ اپنے شاگردوں کو اتنا ہی سبق دیتے جتنا وہ برداشت کر سکیں۔ یوں بھی ان کے حلقۂ ارشاد میں داخلے کی عام اجازت نہیں تھی اور صرف منتخب شاگردوں کے سامنے حقیقت کے اسرار بیان کرتے تھے۔ اکثر اوقات بغداد کے جید صوفیہ جو تصوف کے کسی نہ کسی شعبہ کا ایکسپرٹ کی حیثیت رکھتے تھے حضرت جنیدؒ کے پاس بحث کے لئے آ جاتے۔ حضرت جنیدؒ بہت مختصر جواب دیا کرتے تھے اور ان کی گفتگو پر کبھی یہ گمان نہیں ہوتا تھا کہ وہ بحث کر رہے ہیں۔ ان کے لب و لہجہ میں کمال توازن تھا۔ نہ اونچا بولتے نہ بہت کم اور ان کا ہر ارشاد پُراثر اور روحانی تاثر سے بھرپور ہوتا۔ ایک دن بغداد کے نامور صوفی ابنِ عطاؒ فقر و غنا کے مسئلے پر تبادلۂ خیال کرنے کے لئے آئے ابنِ عطاؒ اس مسئلے پر سند سمجھتے تھے کہ فقر پر غنا کو فضیلت حاصل ہے اور اس مسئلہ پر بھی صوفیہ کے حلقوں میں الگ الگ آراء تھیں۔ ابنِ عطاؒ غنی کی فضیلت بیان کر رہے تھے اور انہوں نے یہ دلیل دی کہ غنی اللہ تعالیٰ کی نعمتوں سے فیض یاب ہوتا ہے اور غنی ہونا اس لئے افضل ہے کہ قیامت کے روز نعمتوں کا حساب مانگا جائے گا اور ظاہر ہے حساب مانگنے والا روبرو ہو گا اور غنی کو خدا کے دیکھنے اور خدا کے کلام کو براہِ راست سننے کا موقع ملے گا اور یہ بہت بڑی سعادت ہے اس کے علاوہ یہ باز پرس کے لمحے ہوں گے۔ لہٰذا باز پرس دوست، دوست ہی سے کرتا ہے۔" حضرت جنیدؒ نے اس کے جواب میں فوراً یہ جملہ کہا۔

"اگر غنی سے حساب مانگا جائے گا تو فقیروں سے عذر خواہی ہو گی اور حساب سے عذر افضل ہے لہٰذا غنی ہونے سے تارکِ حال ہونا زیادہ افضل ہے۔" اسی طرح تصوف کے بارے میں ایک دن بحث ہو رہی تھی تو کسی نے سوال کیا کہ تصوف ہے کیا؟ حضرت جنیدؒ نے فرمایا:

"تصوف درحقیقت ذاتِ باری تعالیٰ کا جوہر ہے اور یہ ایسی صفت ہے جس میں انسان کو قائم کیا گیا ہے۔" ابھی حضرت جنیدؒ نے یہ فقرہ کہا ہی تھا کہ ایک نے کہا۔ "یہ اللہ تعالیٰ کی صفت ہے۔" حضرت جنیدؒ نے جواب دیا: "ہاں اس کی حقیقت اللہ تعالیٰ کی صفت ہے اور ظاہری رسم و حالت میں یہ انسان کی صفت بن جاتی ہے۔" تصوف کی اس تعریف نے بغداد کے صوفیہ کو غور و فکر کے ایک نئے راستے پر ڈال دیا اور تصوف کی رائج الوقت تعریف کے مقابلے میں حضرت جنیدؒ کی تصوف کے بارے میں اس تعریف پر گرما گرم بحثوں کا آغاز ہو گیا اور نئے سرے سے انسان اور خدا کے درمیان تعلق کی نوعیت کی دریافت شروع ہو گئی کیونکہ صوفیہ کی خفیہ محفلوں میں بات یہاں پہنچ کر ختم ہو جاتی تھی کہ جب صوفی تصوف کے آخری مقام پر پہنچ جاتا ہے تو حق کی صفت بن جاتا ہے، اس کا مطلب تھا کہ انسان اور خدا کے درمیان کوئی فاصلہ باقی نہیں رہتا اور حضرت جنیدؒ کی اس تعریف سے یہ ثابت ہوتا تھا کہ فاصلہ ہر حال میں قائم رہتا ہے۔ خواہ وہ کتنا ہی خفیف کیوں نہ ہو، چنانچہ حضرت جنیدؒ کی صحبت میں اس موضوع پر طویل عرصہ تک وعظ و درس ہوتا رہا۔ حضرت جنیدؒ نے اپنی تعلیمات میں اس مسئلے پر جو کچھ اظہارِ خیال کیا ہے اس کا حاصل یہ ہے کہ تصوف اصل و جوہر کے اعتبار سے تو یہ اللہ تعالیٰ ہی کی صفت ہے یہ ایک ایسی مسلسل کوشش ہے جس میں انسان ہمیشہ لگا رہتا ہے اس کے علاوہ تصوف کے بارے میں ان کے یہ اقوال رہنما اصول بن گئے کہ تصوف ان آٹھ صفات کا مجموعہ ہے، سخاوت، رضا، صبر، اشارہ، غربت، صوف کے کپڑے پہننا، سیاحت اور فقر۔ یہ آٹھ صفات انبیاء کی اقتدا میں ہیں۔ سخاوت حضرت ابراہیم علیہ السلام سے کہ آپ نے اپنے بیٹے کی قربانی کے حکم کو تسلیم کیا۔ رضا حضرت اسماعیل علیہ السلام سے کہ وہ قربانی پر راضی ہوئے اور اپنی زندگی پیش کی۔ صبر حضرت ایوب علیہ السلام سے کہ بے پایاں مصیبتوں پر صبر کیا۔ اور اللہ تعالیٰ نے جس آزمائش میں ڈالا ثابت قدم رہے اور اشارہ حضرت زکریا علیہ السلام سے کہ اللہ تعالیٰ نے حکم دیا کہ وہ تین دن تک لوگوں سے کوئی بات نہ کریں گے اور غربت یحییٰ علیہ السلام سے کہ وہ اپنے وطن میں بے وطنوں کی طرح رہے اور اپنے

جوانان میں جھرتے ہوئے خاندان سے بیگانہ رہے۔ سیاحت حضرت عیسےٰ علیہ السلام سے کہ وہ اپنی سیاحت میں تنہا اور مجرد رہے۔ ایک پیالہ اور کنگھی کے سوا اپنے پاس کچھ نہ رکھا اور جب انہوں نے کسی کو دیکھا کہ وہ ہاتھ سے پانی پی رہا ہے تو پیالہ پھینک دیا اور جب کسی کو بالوں کو انگلیوں سے ٹھیک کرتے ہوئے دیکھا تو کنگھی بھی پھینک دی اور صوف کا لباس حضرت موسیٰؑ سے کہ انہوں نے اُونی کپڑے پہنے اور فقر حضرت محمد مصطفیٰ سید عالم صلی اللہ علیہ وسلم سے کہ اللہ تعالیٰ نے دو جہانوں کے خزانوں کی کنجیاں آپ کو مرحمت فرما دی تھیں اور فرمایا تھا کہ خود کو مشقت میں نہ ڈالیں اور ان خزانوں کو استعمال فرما کر آسائش اختیار کریں تو بارگاہِ الٰہی میں رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے عرض کیا۔

"اے خدا! مجھے اس کی ضرورت نہیں۔ میری تو خواہش ہے کہ ایک روز پیٹ بھر کر کھاؤں اور دو روز فاقہ کروں۔"

تصوف کے بارے میں حضرت جنیدؒ کی تعریف اور تشریحات سے درحقیقت کامل صوفیانہ حالت کا تعین ہوتا ہے۔ وہ خود اس حالت میں کامل تھے۔ اس حالت کے بارے میں ان کا یہ ارشاد علوم تصوف میں بڑی اہمیت رکھتا ہے کہ صوفی جب خاموش ہوتا ہے تو وقار حلم کے تحت خاموش ہوتا ہے اور بولتا ہے تو اللہ کے حکم سے بولتا ہے وہ جب اپنے حلقۂ ارشاد میں کسی مسئلے اور موضوع پر گفتگو کر رہے ہوتے تو یوں لگتا جیسے ان پر الہام ہو رہا ہو اور اپنے گہرے ہمہ گیر علم اور اپنی شفاف بصیرت کی بدولت ہر مشکل سے مشکل موضوع کو فہم میں اتار دیتے وہ ہمیشہ بشاش نظر آتے اور ان کی باطنی حالتوں کی شعاعیں ان کی ذات سے نکل کر آس پاس بیٹھنے والے رفیقوں، شاگردوں اور دوستوں تک پہنچتی رہتیں۔

معرفتِ حق میں حضرت جنیدؒ کے بلند مرتبے کا اندازہ اس بات سے بھی لگایا جا سکتا ہے کہ وہ جو کچھ فرماتے تھے وہی ہوتا۔ ایک دن حضرت جنیدؒ بغداد کے ایک بازار میں سے گذر رہے تھے کہ ان کی نگاہ ایک مجوسی پر پڑی جو بے حد حسین اور دلکش تھا۔ حضرت جنیدؒ نے بارگاہ الٰہی میں عرض کی کہ خدایا اسے میری طرف پھیر دیجئے تو نے اسے کتنا حسین خلق فرمایا ہے۔ اسی وقت وہ مجوسی حضرت جنیدؒ کی طرف آیا اور کہنے لگا۔

"اے مرشد! مجھے کلمۂ شہادت پڑھائیے اور مسلمان کر کے درجۂ ولایت پر فائز فرمائیے۔"

حضرت جنیدؒ کے دل میں شیطان کو دیکھنے کی خواہش پیدا ہوئی۔ ایک دن حضرت جنیدؒ مسجد کے دروازے میں کھڑے تھے کہ انہیں دور سے ایک بوڑھا آتا ہوا دکھائی دیا جب اس کا چہرہ اُن کے سامنے آیا تو اسے دیکھتے ہی حضرت جنیدؒ کے دل میں وحشت سی پیدا ہوئی اور اس کے قریب آنے پر پوچھا۔

"اے بڈھے! تو کون ہے کہ وحشت سے میری آنکھیں تمہیں دیکھ نہیں سکتیں، اور ہیبت سے تیرے خیال کی دل میں طاقت نہیں رکھتا۔"

اس نے جواب دیا۔ "میں وہی (شیطان) ہوں جس کے دیکھنے کی تم نے خواہش کی تھی۔"

حضرت جنیدؒ نے فوراً کہا۔ "اے ملعون! حضرت آدم علیہ السلام کو سجدہ کرنے سے تمہیں کس چیز نے روکا تھا؟"

شیطان نے جواب دیا۔ "اے جنیدؒ! تمہارا کیا خیال ہے کہ میں غیر خدا کو سجدہ کرتا۔"

یہ سُن کر حضرت جنیدؒ حیرت زدہ ہو گئے کہ یہ تو ٹھیک کہتا ہے۔ لیکن فوراً ہی غیب سے آواز آئی۔ "اے جنیدؒ! اس سے کہو کہ تو جھوٹا ہے اگر تو فرمانبرداری کرتا تو اس کے حکم اور اس کی مخالفت سے کیوں نکلتا۔" شیطان نے بھی حضرت جنیدؒ کے دل کی آواز سن لی اور چیخ کر کہنے لگا۔

"خدا کی قسم تم نے مجھے جلا دیا ہے۔" اور یہ کہہ کر غائب ہو گیا۔

حضرت داتا صاحبؒ فرماتے ہیں کہ یہ واقعہ حضرت جنیدؒ کی حفاظت و عظمت کی دلیل ہے اس لئے کہ اللہ تعالیٰ اپنے محبوب بندوں کی نگہبانی فرماتا ہے اور ہر حال میں شیاطین کے فریب سے محفوظ رکھتا ہے۔ حضرت جنیدؒ کا ایک مرید کچھ آزردہ دل ہوا اور حضرت جنیدؒ کی محفل سے چلا گیا۔ اور ایک دن اس کے دل میں آیا۔ وہ تجربہ تو کرے کہ حضرت جنیدؒ اس کی ہر حاست گمان اور خیال سے واقف تھے۔ چنانچہ وہ ایک روز حضرت جنیدؒ کے پاس آیا اور ان سے ایک سوال کا جواب چاہا۔ حضرت جنیدؒ نے اس کا سوال سن کر فرمایا "اس کا جواب لفظوں میں درکار ہے یا معنوں میں؟" اس نے کہا دونوں صورتوں میں۔" حضرت جنیدؒ نے کہا کہ اگر تم لفظوں میں جواب چاہتے ہو تو تم نے تجربہ کر لیا ہے لہذا تمہیں میرے تجربے کی ضرورت نہیں حالانکہ تو یہاں تجربہ کرنے آیا ہے۔ اگر معنوں میں جواب چاہتا ہے تو میں اسی وقت تمہیں ولایت سے معزول کرتا ہوں۔" حضرت جنیدؒ نے یہ کہا ہی تھا کہ اس کا چہرہ سیاہ ہو گیا اور گڑگڑا کر کہنے لگا "یا مرشد! میرا سب کچھ مجھ سے چھن گیا ہے۔ اس کے بعد توبہ استغفار میں مشغول ہو گیا۔ اس وقت حضرت جنیدؒ نے اس سے ارشاد فرمایا "تو نہیں جانتا کہ اللہ کے دوست بھیدوں کے والی اور حاکم ہیں اور تو ان کے زخم کی تاب نہیں رکھتا۔" پھر آپ نے اس پر دم کیا جس سے اُسے دوبارہ مراد حاصل ہو گئی اور اس نے دعویٰ نگاہی سے ہمیشہ کے لئے منہ موڑ لیا۔

حضرت جنیدؒ کے ایک اور شاگرد ابو عبدالرحمان بن یحییٰ بن جلال رحمۃ اللہ علیہ جو بعد میں معرفت کے اونچے مرتبے پر فائز ہوئے دنیا کے خیال کو دل سے خارج کرنے کے لئے انہوں نے ایک طویل عرصہ حضرت جنیدؒ کی صحبت میں گذارا اور تب کہیں جا کر نفس کی کشاکش سے آزاد ہوئے۔ حضرت یحییٰ بن جلالؒ نے بیان کیا ہے کہ میں ایک دن بازار میں ایک لڑکے کے حسن وجمال میں محو ہو گیا اور حیرت زدہ ہو کر اس کے سامنے کھڑا ہو گیا۔ اتفاق سے حضرت جنیدؒ وہاں سے گذرے اور میں نے اُن سے پوچھا "اے مرشد! کیا اللہ تعالےٰ ایسے حسین چہرے کو بھی دوزخ میں جلا دے گا؟" انہوں نے کمال شفقت سے فرمایا "اے میرے بیٹے! تمہارے دل میں اس خیال کا آنا سر سر نفس کا تماشہ ہے اور نہ کہ عبرت کا نظارہ۔ اگر تم اسے عبرت سے دیکھتے تو کائنات کے ہر ذرے میں تمہیں یہی عجائبات نظر آئیں گے اور تمہارا صرف اس پیکرِ حسن کو دیکھنا فعلِ الٰہی کی بے حرمتی ہے اور بہت جلد تمہیں اس کی سزا ملے گی۔"

یہ کہہ کر حضرت جنیدؒ منہ پھیر کر چل دیئے تو اسی وقت میرے حافظہ سے قرآن پاک اتر گیا اور یہاں تک کہ سالہا سال تک میں نے اللہ تعالیٰ سے معافی مانگی، توبہ کی اور پھر کہیں مجھے قرآن کی نعمت حاصل ہوئی۔

حاضر اور غیر حاضر کی دو حالتیں صوفیانہ پیرو دستور میں صوفی کے مقام اور حال کی خبر دیتی ہیں اور یہ دونوں اصطلاحیں دوسری اصطلاحوں مدہوشی و ہوش، فقر و غنا، جمع و تفرقہ اور تنگی و کشادگی کی طرح بہت اہم ہیں اور صوفیائے کرام کے درجات کا اندازہ انہی دونوں اصطلاحی حالتوں سے لگاتے ہیں جن کا مختصر سا مفہوم یہ ہے کہ غیر حاضر کا مطلب اپنے آپ سے غائب ہونا اور خدا کی بارگاہ میں حاضر ہونا ہے۔ اس پر بھی صوفیہ کے دو مکاتیبِ فکر تھے ایک حاضر ہونے کو مقدم جانتا تھا اور دوسرا غیر حاضر ہونے کو فضیلت دیتا تھا۔ اس علمی میں حضرت جنید بغدادیؒ کو حضورِ حق کا جو مقام حاصل تھا اس کی نوعیت یہ تھی کہ وہ اس صورت میں غیر حاضر تھے کہ وہ اپنے ہر ارادے سے غائب تھے اور حق تعالیٰ ہی ان کا ملجا تھا اسی سلسلے میں ان کے اقوال میں بہت لطیف اشارے ملتے ہیں۔ ایک مرتبہ ایک شخص نے ان کی خدمت میں حاضری دی اور درخواست کی کہ وہ تھوڑی دیر اس کے پاس رہیں کہ وہ اُن سے کچھ کہنا چاہتا تھا۔

حضرت جنیدؒ نے کہا: "اے جوانمرد! تم مجھ سے وہ بات چاہتے ہو جس کی میں خود ایک طویل عرصے سے خواہش رکھتا ہوں۔ برسوں سے اسی تمنا میں الجھا ہوا ہوں کہ ایک لمحہ کے لئے بھی تو اپنے آپ میں موجود ہوں۔ لیکن ابھی تک ایسا وقت نہیں، اور اب تمہارے پاس کیسے کچھ دے سکتا ہوں۔" حضورِ حق کے سلسلے میں ایک اور جگہ حضرت جنیدؒ نے فرمایا ہے۔

"مجھ پر ایسا وقت بھی گذرا ہے کہ تمام زمین و آسمان میری پریشانی پر اشک فشاں تھے پھر ایسا زمانہ آیا کہ میں ان کے غائب ہونے پر گریہ زاری کرتا رہا اور اب وہ وقت ہے کہ مجھے نہ اپنی خبر ہے نہ زمین و آسمان کی۔"

حضرت جنید بغدادی رحمۃ اللہ علیہ کی یہ نظم مشاہدہ حق میں ان کی استقامت کی شہادت دیتی ہے۔ ایک بار حضرت جنیدؒ کے ایک شاگرد کے دل میں یہ خیال پیدا ہوا کہ وہ درجۂ کمال تک پہنچ گیا ہے اور میرے لئے ضروری ہے کہ میں مرشد کی صحبت سے کنارہ کشی کر دوں اور اکیلا رہوں۔ مجھے اب مزید رہنمائی کی ضرورت نہیں، چنانچہ اس نے صوفیہ کی محفلوں میں آنا جانا چھوڑ دیا اور جب رات ہوئی تو اس نے دیکھا کہ کچھ لوگ اونٹ لے کر آئے ہیں اور اس سے کہنے لگے کہ تمہیں اب جنت میں رہنا چاہیئے اور یہ اونٹ تمہیں جنت میں لے جانے کے لئے ہیں۔ وہ اسے اونٹ پر سوار کرا کے لے گئے اور ایک ایسی جگہ پہنچے جو جنت نگاہ تھی، خوبصورت لوگ، نفیس کھانے اور ٹھنڈے میٹھے پانیوں کے چشمے تھے۔ صبح تک ان لوگوں نے اسے اسی جگہ رکھا حالانکہ وہ مرید محوِ خواب تھا، جب اس کی آنکھ کھلی تو اپنے آپ کو اس نے اپنے حجرے میں پایا۔ تاہم یہ سلسلہ روزانہ جاری رہا۔ اونٹوں والے آتے اسے اس مقام پر لے جاتے اور صبح کو وہ پھر اپنے حجرے میں ہوتا۔ اس عمل سے اس میں اور زیادہ تکبر اور رعونت پیدا ہو گئی۔ اور جوانی کے گھمنڈ میں اس کی زبان سے یہ اظہار بھی ہونے لگا کہ وہ روزانہ رات کو جنت میں ہوتا ہے۔ لوگوں نے یہ خبر حضرت جنیدؒ تک بھی پہنچا دی۔ آپ اٹھے اور اس کے حجرے میں گئے تو اس وقت بھی خواہشوں کے تخت پر تکبر و غرور میں بیٹھا تھا۔ حضرت جنیدؒ نے استفسار کیا تو اس نے رات والا قصہ خود اپنی زبانی سنا دیا۔ یہ سن کر حضرت جنیدؒ فرمانے لگے "یہ بات ہے تو آج رات جب تم وہاں پہنچو تو تین مرتبہ لاحول و لا قوۃ الا باللہ العلی العظیم پڑھنا۔" یہ کہہ کر حضرت جنیدؒ چلے گئے۔ اور رات کو جب وہ اونٹوں پر اسی جگہ پہنچا تو حضرت جنیدؒ کا منکر ہو جانے کے باوجود اس نے محض تجربہ کے لئے تین مرتبہ لاحول ولا پڑھا تو اس کے پڑھتے ہی اس کو لانے والے لوگ چیخیں مار کر بھاگ گئے اور مرید نے اپنے آپ کو نجاست والی جگہ پر پڑے پایا جہاں چاروں طرف مرداروں کی ہڈیوں کے ڈھیر تھے۔ وہ یہ منظر دیکھ کر کانپ اٹھا اور توبہ کر کے دوبارہ مرشد کی صحبت میں رہنے لگا۔ حضرت جنیدؒ فرماتے ہیں کہ "مرید کے لئے اکیلے رہنے میں بڑی مصیبتیں ہیں۔"

حضرت جنیدؒ کے بارے میں جو معلومات حاصل ہوتی ہیں ان میں یہ واقعہ بھی شامل ہے کہ جب بغداد کے علماء صوفیہ نے ان سے وعظ و درس کی درخواست کی اور انہوں نے یہ درخواست تو اس وقت تک نہ تسلیم کی جب تک کہ خود رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو ہدایت نہ کی۔ اور حضرت جنیدؒ فرماتے ہیں کہ اسی دوران ایک رات ان پر کام کاج کے بعد نیند کا غلبہ ہوا اور وہ سونے جاگنے کی حالت میں تھے کہ انہوں نے ایک فرشتے کو آسمان سے اترتے دیکھا اس نے اپنی روح میرے سینے میں انڈیل دی اور مجھ سے کہنے لگا: "ابو القاسم اٹھ اور لوگوں سے خطاب کر! تمہارے اندر اب روح موجود ہے۔"

حضرت جنیدؒ فرماتے ہیں کہ میں یہ سن کر زار و قطار رونے لگا۔ ان کے شاگردوں کی تحریریں شہادت دیتی ہیں کہ جب انہیں خطاب کرنے کا امر ہوا تو ان کی گفتگو سراسر ایک صوفی کی گفتگو ہوتی تھی۔ وہ اپنے صوفیانہ افکار کا اظہار ایک عالم کی طرح نہیں کرتے تھے اور نہ ہی کسی مسئلے کی تفصیل میں کھو جاتے تھے۔ ان کی گفتگو سنتے وقت یوں محسوس ہوتا تھا جیسے ان کے دل کا دروازہ کھلا ہے اور ان کی روح باطن میں جو کچھ ہوتا ہے سامنے لاکر رکھ دیتی ہے۔ ایک مرتبہ کسی شخص نے ان سے صوفیہ کی باتوں کے بارے میں سوال کیا اور حضرت جنیدؒ نے فرمایا۔ "صوفی تو باتیں ہی نہیں کرتے۔" اور ابن خفیفؒ سے کسی نے یہی سوال کیا تو انہوں نے بھی یہی کہا کہ جو کچھ حضرت جنیدؒ نے کہا درست ہے۔ صوفی کا دنیا کی کسی چیز سے تعلق نہیں ہوتا سوائے ان دیکھی دنیا کے، اور جب اس کی زبان کھول دی جاتی ہے اور خدا اسے بولنے کی اجازت دیتا ہے تو وہ کلام کرتا ہے ورنہ وہ خاموش بیٹھا رہتا ہے۔ فی الحقیقت تو ان لوگوں کا حصہ ہے جو اس موضوع پر اصل کتابوں کی تفہیم حاصل کرتے ہیں۔ اور انہیں زبانی یاد کرتے ہیں اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ حضرت جنیدؒ نے بہت کم کتابیں لکھیں اور زیادہ زبانی درس دیا۔ البتہ ان کی چند کتابوں کا تذکرہ ضرور ملتا ہے جو نایاب ہیں ان میں ان کے شاگرد حضرت سراجؒ نے ایک کتاب کا حوالہ دیا ہے جس کا نام شرح شطحیات ابی یزید بسطامی ہے۔ ایک اور سوانح نگار ابن الندیم نے آپ کی دو کتابوں کی نشاندہی کی ہے۔

۱ : کتاب امثال القرآن

۲ : کتاب رسائل جنیدؒ

۳ : تصحیح الارادہ۔ اس کتاب کا ذکر حضرت داتا صاحبؒ نے کشف المحجوب میں کیا ہے۔ محققین کی رائے میں یہ کتابیں محفوظ نہیں ہیں۔ صرف رسائل جنیدؒ کا بھی کچھ حصہ محفوظ ہے جو استنبول میں ملا ہے اور یورپ اور مصر کے جدید صوفی محققین نے ان رسائل کی روشنی میں حضرت جنیدؒ کے نظامِ افکار کا تعین کیا ہے اور ان کی شخصیت و سیرت کے خد و خال ابھارنے میں ان کے شاگردوں کی کتابوں سے مدد لی ہے۔ حال ہی میں حضرت جنیدؒ کے استنبول سے ملنے والے رسائل پر مبنی ایک کتاب قاہرہ یونیورسٹی کے صدر شعبہ دینیات ڈاکٹر علی حسن عبدالقادر نے انگریزی زبان میں لکھی ہے اور مغرب میں اس کتاب کی اشاعت سے دنیائے تصوف کے بارے میں اہلِ علم و دانش کو نئے آفاق کا پتا چلا ہے، مؤلف نے لکھا ہے کہ یہ رسائل حضرت جنیدؒ کے نظامِ افکار سے پردہ اٹھاتے ہیں۔ ان تحریروں میں حضرت جنیدؒ نے اسلامی تصوف کے بنیادی اصول بیان کئے ہیں اور یہ تحریریں تیسری صدی ہجری کے جلیل القدر صوفی معلم حضرت جنیدؒ کی تمام مقامی زبان میں لکھی ہوئی وہ ذاتی تحریریں ہیں جن میں انہوں نے اپنے صوفیانہ نظریات و عقائد کی وضاحت کی ہے جو گہرے اور رازدارانہ لب و لہجہ میں قلم بند کئے گئے ہیں۔ اور دنیائے اسلام کے علاوہ دنیا بھر کے علمی، ادبی اور تحقیقی اداروں نے اس پر اتفاق کیا ہے کہ جو کچھ امام شافعیؒ نے فقہ اسلامی کے لئے کام کیا ہے وہی کچھ حضرت جنیدؒ نے تصوف کے سلسلے میں کیا ہے اور انہوں نے صوفیانہ نظریات کی تشریح کے بعد انہیں اس سطح تک مربوط بنایا ہے جو بعد کی نسلوں کے لئے رہنما ثابت ہوئے۔

تاریخی طور پر حضرت جنیدؒ کے ان تخلیقی کارناموں کا جائزہ لیا جائے تو یہ ماننا پڑے گا کہ جس قسم کے عہد میں حضرت جنیدؒ کو مسندِ ارشاد سنبھالنا پڑی ان کا تقاضا ہی یہی تھا کہ حضرت جنیدؒ جو حق کی حمایت اور باطل کی تردید کے لئے مامور کئے گئے تھے۔ لوگوں اور آنے والی نسلوں کو صوفیانہ افکار و نظریات کی حقیقت سے آگاہ کرتے۔ چنانچہ ان حالات کے آئینے میں ہم دیکھتے ہیں کہ انہوں نے پہلے تو اپنے عہد کے مختلف النوع صوفیانہ نظریات کو اپنے اندر جذب کیا پھر اپنے علم و تجربے اور شخصیت و سیرت کی تاثیر کے لئے انہیں ایک خاص فریم ورک اور ان میں اپنے خیالات و تجربات کا اضافہ کر کے اپنے مخصوص صوفیانہ مکتبۂ فکر کا نظام کار تشکیل دیا اور ہمیں تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ حضرت جنیدؒ نے تصوف کو اسلام کی حدود میں رکھ، صوفیہ کے افراد کے نظریات کو جو اسلام کی رو سے بہت ہی عجیب و غریب تھے ایک لڑی میں پرو دیا اور عمل د

اخلاقی زیادتیوں اور مبالغہ آمیزیوں کو تصوف کے چہرے کو مسخ کرنے میں پہنچنے دیا۔ چنانچہ اس وقت سے لے کر آج تک کے جدید دور میں انہیں اُن کے اسی الہامی کارنامے سے شیخِ طریقت، سردارِ طائفہ اور مرشدِ عارفین کے لقب سے یاد کیا جاتا ہے۔

حضرت جنید بغدادیؒ کے عہد میں عموماً صوفیہ تصوف کی خفیہ تعلیم دیتے تھے اور انہوں نے صوفیانہ مطالب کے لئے اشارے بنائے ہوئے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ عام لوگ ان تعلیمات کو سمجھنے سے قاصر ہیں لہٰذا اس علم کو عام لوگوں سے چھپانا ہی چاہیئے اس سلسلے میں ان کا خاص موضوع توحید تھا اور توحید کو اپنے خاص عقائد اور اصولوں کے تحت بیان کرتے تھے حضرت جنیدؒ بھی اسی اصول پر کاربند تھے اور نہ صرف اپنے شاگردوں کو احتیاط اور رازداری کی تلقین کرتے تھے بلکہ اپنے ہمعصروں کو بھی یہی مشورہ دیتے تھے کہ وہ محتاط رہیں اور ایسا نہ ہو کہ کہیں لوگ ان کے افکار کو غلط سمجھ لیں اور غلط فہمیوں میں مبتلا ہو جائیں۔ چنانچہ حضرت جنیدؒ نے اپنے ایک صوفی دوست کو ایک خط لکھا اور اس میں بھی اسی چیز کی طرف توجہ دلائی کہ :

"تمہارے ساتھ تبادلۂ خیال کرتے ہوئے یہ مشکل درپیش تھی کہ میرا کہیں یہ خط کسی ایسے شخص کے ہاتھ نہ لگ جائے جس کے پاس وہ علم ہی نہ ہو جو تمہارے پاس ہے۔ کچھ عرصہ ہوا میں نے اصفہان میں اپنے ایک دوست کو خط لکھا۔ کسی نے اسے کھول کر پڑھ لیا لیکن وہ اسے کچھ سمجھ نہ سکا جس کا مجھے واقعی افسوس ہے لیکن انسان کو ان لوگوں کے معاملے میں رحم دل ہونا چاہئے اور کوشش کرنی چاہیئے کہ ان کے ساتھ تجربات کرے وہ ایسے انداز میں ہو کہ ان کی سمجھ میں آسکے۔ خدا تمہیں اپنی حفاظت میں رکھے، تمہیں بھی اپنی زبان میں محتاط رہنا چاہیئے اور اپنے ہمعصروں کو سمجھنا چاہیئے لوگوں کے ساتھ گفتگو کرتے وقت ہمیشہ وہی بات کہو جسے وہ سمجھ سکیں اور وہ باتیں نہ کہو جو ان کی سمجھ میں نہ آسکیں۔"

حضرت جنیدؒ کا یہ ذاتی خط اس طرف اشارہ کرتا ہے کہ بعض صوفیہ جن میں حسین بن منصور حلاجؒ سرِفہرست ہیں، اظہارِ بیان میں بے باک تھے اور تیسری صدی ہجری میں، ایک ایسے واقعہ کا عنوان بن گئے جو بعد میں ادب اور لٹریچر کا مستقل موضوع بنا۔ آج بھی منصورؒ ایک علامت کے طور پر معروف ہیں اور بغداد کے مدرسۂ تصوف کے لئے، ایک کڑی آزمائش ثابت ہوئے ان حالات کا حضرت جنیدؒ کی زندگی پر شدید اثر بھی ہوا اور ان کے بعض عزیز ترین رفیقوں کو سزا و عتاب کا نشانہ بننا پڑا۔ ان واقعات میں حسین بن منصور حلاجؒ کے علاوہ حضرت سمنونؒ اور حضرت ابوبکر شبلیؒ بھی نمایاں کردار ہیں۔ مدرسۂ بغداد پر اظہارِ بیان میں غیر محتاط رویئے کے سبب جو عتاب نازل ہوا، حضرت جنیدؒ اس سے پہلے ہی آگاہ تھے اور اس وقت کی سوسائٹی کے طرزِ فکر اور عمومی سوچوں کے گہرے تجزیے کے بعد وہ محتاط ہونے کی تلقین فرمایا کرتے تھے کیونکہ ایک تو صوفیہ اپنی مخصوص عادت اور افکار کی وجہ سے عوام میں بدعتی مشہور تھے اور توجہ سے رسائی کے بارے میں ان کے خیالات خطرناک حد تک پہنچ جانے سے، ان پر کفر و الحاد کا الزام بھی عاید ہونے لگا تھا۔ اس کی گہرائی میں جانے کے لئے ضروری ہے کہ ہم ان موردِ الزام صوفیہ حسین بن منصور حلاج، ابوبکر شبلیؒ، اور سمنون رحمۃ اللہ علیہ کی شخصیت اور افکار میں جھانکیں جن کے باعث حضرت جنیدؒ کو بھی بغداد کے ان صوفیہ کی وجہ سے بدعتی قرار دیا جاتا تھا۔ حالانکہ حضرت سراجؒ کے بیان کے مطابق حضرت جنیدؒ جنہیں بہت سی چیزوں کا گہرا علم تھا اور اس کے باوجود کہ انہیں ایک عظیم دینی بزرگ سمجھا جاتا تھا اور وہ ذہنی سطح سے بھی بہت باعظمت تسلیم کئے جا چکے تھے لیکن دینی شعائر کی پابندی کے باوجود لوگوں نے ان کے خلاف گمراہی اور کفر کا فتویٰ دیا۔

حضرت حسین بن منصور حلاجؒ حضرت جنیدؒ کے شاگردوں میں تھے اور ان کی پرورش تستر میں ہوئی۔ ابتداء میں حضرت سہیل التستریؒ کی صحبت اختیار کی جو شریعت و طریقت میں جامع تھے وہ حقیقت کے علم میں ان کے ارشادات عام فہم اور پُراثر تھے۔ لیکن منصور حلاجؒ اچانک بغداد آ گئے اور حضرت عمرو بن عثمان المکیؒ کے حلقۂ ارشاد میں داخل ہو گئے۔ حضرت المکیؒ حضرت جنیدؒ کے معاصر تھے اور توحید کے کلام میں ان کے اشارات ابہام اور اخفاء سے بھرپور ہوتے تھے ان کی کچھ تحریریں تھیں جن کے اندر مخصوص و مخفی علم کی باتیں تھیں جو منصور حلاجؒ کے ہاتھ لگ گئیں۔ لیکن انہیں اس کا علم نہیں تھا تاہم وہ ان تحریروں کی گمشدگی کے بارے میں فکرمند تھے اور کہتے تھے کہ مجھے ڈر ہے کہ جس کے پاس یہ تحریریں ہیں کہیں اس کا سر قلم نہ کر دیا جائے۔ عمرو المکیؒ ویسے بھی منصور حلاجؒ کی بے باکی سے نالاں تھے۔ ایک مرتبہ قرآن پاک کی تلاوت کر رہے تھے کہ حلاجؒ نے کہا "ایسا کلام تو میں بھی بول سکتا ہوں۔" محققین کی رائے میں وہ اپنا عقیدۂ توحید حد سے زیادہ بڑھی ہوئی حقیقت پسندی کے انداز میں پیش کرتے تھے جس کی مسلمانوں میں تاب نہیں تھی۔ چنانچہ انہوں نے اپنی تصنیف کتاب الطواسین کے اس نعرے میں اپنا عقیدہ سمو دیا۔ "انا الحق" (میں ہی وجودِ خداوندی ہوں) حلاجؒ نے ایک مرتبہ اپنے ایک دوست کے نام ایک خط لکھا جس کا آغاز اس طرح کیا "یہ خط ہے الرحمٰن الرحیم کی طرف سے"۔ جب اُن کے سامنے یہ تحریر رکھی گئی تو انہوں نے اقرار کیا اور کہا یہ خط میں نے ہی لکھا ہے۔ ان سے جب پوچھا گیا کہ اب تک تو آپ پیغمبرانہ قوت و اختیار کا دعویٰ کرتے رہے ہیں اب آپ نے خدائی کا دعویٰ بھی کرنا شروع کر دیا ہے۔ منصور حلاجؒ نے جواب دیا "میں اپنی خدائی کا دعویٰ تو نہیں کر رہا۔ یہ تو وہ چیز ہے جسے ہم صوفی "عین الجمع" (ارادۂ خداوندی کے ساتھ کامل انفعال کے نام سے تعبیر کرتے ہیں۔ خدا کاتب ہے اور میں آلۂ کتابت ہوں"۔ ان سے جب یہ پوچھا گیا کہ اور کون کون سے صوفیہ اس اصول کے قائل ہیں حلاج نے ابن عطاؒ، ابو محمد الجریریؒ اور ابوبکر شبلیؒ کے نام لئے، جریریؒ اور شبلیؒ نے اس کی تصدیق سے انکار کر دیا۔ حضرت عمرو المکیؒ منصور حلاجؒ سے سخت ناراض تھے اور انہیں اس بات پر سخت رنج تھا کہ منصور حلاجؒ کھلے بندوں کشف و کرامات کا مظاہرہ کرتے تھے اور لوگوں کو واضح روحانی کمالات دکھا کر اسلام کی طرف مائل کرتے تھے۔ وہ اپنی صوفیانہ مدہوشی میں اتنے گہرے چلے گئے تھے کہ حضرت عمرو المکیؒ انہیں اپنے حلقۂ ارشاد سے علیحدہ کرنے پر مجبور ہو گئے۔ اور اس کا باقاعدہ اعلان بھی ہوا کیونکہ حکومتی سطح پر شرعی احکام کی خلاف ورزی پر نظریں تیار ہو رہی تھیں۔ اور ان پر طرح طرح کے الزامات عائد کئے جا رہے تھے، روزانہ مسجدوں اور دانشگاہوں میں منصور حلاجؒ کے خلاف سنگین کارروائی کرنے کی قراردادیں منظور کر کے خلیفہ کو روانہ کی جا رہی تھیں اور زہر آلود تقریروں میں ثابت کیا جا رہا تھا کہ منصور حلاجؒ نے کفر کا ارتکاب کیا ہے صوفیانہ حلقوں میں اس کا عمل سراسر علمی اور نظریاتی تھا۔ مستند صوفی، اساتذہ جو منصور حلاجؒ کے اس رویئے پر نازاں ضرور تھے لیکن ان کے روحانی مرتبے کے قائل بھی تھے، یہاں یہ بھی بتا دینا ضروری ہے کہ مغربی محققین کی رائے میں حضرت منصور حلاجؒ اتنے دور چلے گئے تھے کہ وہ اپنے ضمیر کے ساتھ مصالحت نہ کر سکے اور انہوں نے دین اور حکومت کے عمومی اقتدار کے سامنے ایسا شخصی اقتدار لا کھڑا کیا تھا جو ایک خدا پرست کو براہِ راست خدا سے حاصل ہوتا ہے اور منصور حلاجؒ کی دینی اور سیاسی سطح پر مخالفت کا باعث رازِ حقیقت کا انکشاف نہیں تھا بلکہ وہ اپنے باطن کے تحت ایسی حقیقت کو منوانے کی راہ پر چل پڑے تھے جو دینی اور سیاسی انارکی کا سبب بن سکتی ہے۔"

خلیفہ کے سیکرٹریٹ میں عوامی ردِعمل پر غور کیا جا رہا تھا کہ منصور حلاجؒ حضرت جنیدؒ کے حلقہ میں گئے۔ حضرت جنیدؒ نے پوچھا "تمہاری آمد کا مقصد کیا ہے؟"

منصور حلاجؒ نے نہایت ادب سے جواب دیا "میں آپ کی صحبت اختیار کرنے کی غرض

سے حاضر ہوا ہوں۔"

حضرت جنیدؒ نے کہا" میں دیوانوں کو اپنی صحبت میں نہیں رکھ سکتا۔ کیونکہ صحبت کے آداب کا تقاضا یہ ہے کہ صحبت اختیار کرنے والا ہوش اور تمیز کا شعور رکھتا ہو۔ اگر یہ عافیت موجود نہیں ہے تو اس کا نتیجہ بھی اسی قسم کا ہو گا جو عبداللہ تستریؒ اور عثمان المکیؒ سے تمہاری دوستی کے بعد برآمد ہوا ہے۔"

حسین بن منصور حلاجؒ نے اس کے جواب میں کہا۔ "یا مرشد! ہوش اور مدہوشی انسان کی دو صفتیں ہیں اور جب تک انسان کی ساری صفات ختم نہ ہو جائیں وہ اپنے خالق سے دور اور پوشیدہ ہے۔"

حضرت جنیدؒ نے ان کی طرف دیکھا اور کہا۔ "ابن منصور! ہوش اور مدہوشی کے بارے میں تم غلطی پر ہو۔ ہوش خدا کے معاملے میں انسان کی سلامتی عقل پر دلالت کرتا ہے اور مدہوشی تمنا کی حد سے گذر جانے اور عشق کی انتہا پر پہنچ جانے کی علامت ہے اور یہ دونوں چیزیں ایسی ہیں کہ ان میں سے کسی ایک میں بھی انسان صرف اپنی جدوجہد کے بل پر پورا نہیں اتر سکتا۔ اور مجھے تمہارے افکار و خیال میں زیادہ تر حماقت اور دیوانگی ہی دکھائی دیتی ہے۔"

منصور حلاجؒ حضرت جنیدؒ کے ہاں سے بھی چلے آئے اور نظریۂ مدہوشی پر اپنے عقیدے کی اصلاح پر آمادہ نہ ہوئے۔ اور صوفیہ کے ایک مخصوص حلقے کے سوا ہر سطح پر ان کے عقیدہ کی تردید اور مذمت جاری تھی، منصور حلاجؒ پر سرکاری سطح پر عدالت میں مقدمہ چلا مقدمے کے شرعی جواز پر کئی دن بحث ہوتی رہی کئی صوفیہ کو عدالت میں اس مسئلے پر طلب کیا گیا جنہوں نے منصور حلاجؒ کے عقیدۂ توحید کی نفی کی اور ان سے اپنے تعلق کی تردید کی لیکن منصور حلاجؒ نے بر سر عدالت بھی اپنے موقف کو پُر جوش انداز میں پیش کیا اور سپریم کورٹ کی سطح پر ایک عدالتی فیصلے کے مطابق انہیں شریعت کے باغی اور بدعقیدہ ہونے کے جرم میں موت کی سزا سنا دی گئی جس کا عوامی حلقوں میں خیر مقدم کیا گیا اور عثمان المکیؒ کی پیش گوئی حرف بحرف پوری ہو گئی جو انہوں نے اپنی خاص اور مخفی تحریروں کی گمشدگی پر کی تھی۔

عباسی خلفاء کے عہد میں منصور حلاجؒ کو پھانسی دینے کا واقعہ خاصا سنسنی خیز تھا اور جمعے کے خطبوں میں اس فیصلے کی پُر زور حمایت کی گئی اور شریعت کی رو سے فرض ادا کرنے پر حکومت کو مبارکباد دی گئی۔ لیکن صوفیہ کے بارے میں عوام الناس اور خاص دینی حلقوں کی طرف سے تنقید تند و تیز رخ اختیار کر گئی اور دوسرے بہت سارے صوفیہ کے لئے سی آئی ڈی کا جال بچھا دیا گیا۔ جس روز منصور حلاجؒ کو پھانسی دی گئی تو ایک بہت بڑے صوفی نے کہا "میں نے وہ رات سولی کے نیچے بیٹھ کر عبادت میں گذاری اور جب صبح کا اجالا ہوا تو میرے کانوں میں آواز آئی کہ ہم نے اس پر راز شاہی عیاں کر دیا ہے۔ یعنی اس شخص نے جتنی اذیت اور ملامت اٹھائی ہے وہ اس کی وجہ سے ہے۔" کہتے ہیں حضرت ابوبکر شبلیؒ جو حضرت جنیدؒ کے اہم ترین تاریخی شاگرد ہیں تمام رات عبادت کرتے رہے اور صبح کے وقت ان کی آنکھ لگ گئی تو انہوں نے خواب میں روز آخرت کا منظر دیکھا جس میں اللہ تعالیٰ فرما رہے تھے "یہ اس لئے ہوا کہ اس نے ہمارا راز دوسروں پر افشا کر دیا۔"

منصور حلاجؒ کے پھانسی پانے کے بعد صوفیہ اور زیادہ محتاط ہو گئے۔ تصوف کے بارے میں عوام کے رجحانات تبدیل ہو گئے علم و دانش کی سلامت نجیب و عامہ بن گئے جو صرف حکومت ہی عزت کرتی تھی۔ صوفی بزرگ عام زندگی سے قطع تعلق کرنے پر مجبور ہو گئے۔ ان کی خاموشی اور احتیاط سے اندازہ ہوتا ہے کہ عوام اور حکومت کے نزدیک ان کی خاموشی اور احتیاط بھی شکوک و شبہات سے خالی نہ تھی۔ یہاں یہ وضاحت ضروری ہے کہ منصور حلاجؒ کے مذموم اور متنازع کردار کے باوجود صوفیہ میں ان کا احترام پہلے ہی کی طرح کیا جاتا تھا ان کی تصنیفات

بردبار تدبر کام ہوا۔ اس سلسلے میں حضرت داتا صاحبؒ کی منصور حلاجؒ کے متعلق آراء سے ثابت ہوتا ہے کہ ان کو پھانسی دینا اور ان کا پھانسی کو بعد شوق قبول کرنا باطنی اسرار میں سے ہے۔ حضرت داتا صاحبؒ فرماتے ہیں منصور حلاجؒ طریقت کے مشتاقوں اور مستوں میں سے تھے ان کا صوفیانہ حال مستحکم اور ان کی صوفیانہ ہمتیں بلند تھیں حالانکہ صوفی مرشدین کے ایک حلقے کے نزدیک وہ قابل مذمت ہیں اور دوسرا انہیں مقبول حق قرار دیتا ہے تیسرے گروہ نے جس میں حضرت جنیدؒ بھی شامل ہیں ان کے بارے میں اپنی رائے کو محفوظ رکھا ہے اور چوتھا گروہ انہیں جادوگر قرار دیتا ہے۔ حضرت داتا صاحبؒ کے زمانے کے اساتذہ منصور حلاجؒ کو بزرگ سمجھتے ہیں اور ان کے حال کی صفائی اور کثرت ریاضت و اجتہاد کے قائل ہیں۔ کشف المحجوب میں حضرت داتا صاحبؒ نے منصور حلاجؒ کا تذکرہ بطور خاص کیا ہے اور کہا ہے کہ منصور حلاجؒ مجھے عزیز ہیں لیکن ان کے حالات میں فتنہ ہے اور مجھے اپنے ابتدائی احوال میں ان سے بہت توانائی ملی ہے اس کے علاوہ وہ اپنے حال کے غلبہ میں تھے اور اس کی بنیادی وجہ انتہائے اشتیاق ہے۔

اس میں شک نہیں کہ منصور حلاجؒ تیسری صدی ہجری کے سربرآوردہ صوفیا میں تھے لیکن ان کی وجہ سے بغداد کے صوفیہ پر جو عتاب نازل ہوا اور صوفیانہ رجحان میں کمی ہوئی اس کا آنے والے زمانوں پر گہرا اثر ہوا اور اسلامی تصوف میں من مانی تعبیروں کا سلسلہ رک گیا۔ محققین نے اس سلسلے میں حضرت جنید بغدادیؒ کے متوازن اور معتدل رویے کے حوالے سے ثابت کیا ہے کہ وہ تصوف میں مدہوشی کی بجائے ہوش کے نظریئے کے خالق ہیں اور منصور حلاجؒ کے واقعہ سے ان کے نظریۂ ہوش کی صداقت پوری طرح واضح ہو جاتی ہے۔ لیکن صوفیہ پر جو عتاب نازل ہوا اور عوام اس شبہ میں مبتلا ہو کر جس بدظنی کا شکار ہوئے اس کے علاوہ علمائے حق کی بجائے جاہ و طلب کے مارے ہوئے علماء کی تعظیم و تکریم کے رجحان کے فروغ کے بارے میں حضرت جنیدؒ کے صوفیانہ تاثرات اس پورے دور کے مزاج کی عکاسی کرتے ہیں۔ حضرت جنیدؒ کے ایک خط کا اقتباس بھی اس کی تصدیق کرتا ہے جس میں انہوں نے لکھا۔

"وہ جو علم کے فرائض اور اس کی فضیلتوں کی جستجو میں لگے ہیں اور بر خلوص عمل کے ذریعہ اللہ تعالیٰ کا قرب اور اس کی دوستی کے خواہاں ہیں جان لیں کہ لوگوں کے قدم حقیقت کی راہ سے بھٹک گئے ہیں اور ان کے دل صحیح ارادوں پر قائم نہیں ہیں۔ وہ اپنے نفوس کی دبی ہوئی خواہشوں کے زیر اثر اپنے خوشنما ظاہر کی طرف زیادہ متوجہ ہو گئے ہیں اور ان کی طبیعتوں کا میلان لوگوں کی تحسین و آفرین اور تعظیم و تکریم کی جانب ہو گیا ہے۔ انہیں یہ چیز زیادہ پسند آگئی ہے کہ ان کے گرد لوگوں کا جمگھٹا لگا ہو اور ان کی جانب ہر طرف سے انگلیوں کے اشارے ہو رہے ہوں۔ یہاں تک کہ ان کی ہر رائے صحیح قرار پائے اور ان کا ہر قول درست مانا جائے، ان کا مرتبہ بلند تسلیم کیا جائے اور ان کے حق میں مدح و ستائش کا سلسلہ جاری رہے اگر ان میں سے کسی چیز میں بھی کمی واقع ہو جائے تو یہ انہیں بہت ناگوار گذرتا ہے اور اگر کوئی شخص ان کی خواہشات کے خلاف کچھ کہہ دے تو پھر یہ نہ پوچھو کہ ان کے غیض و غضب کا کیا عالم ہوتا ہے۔"

منصور حلاجؒ کی حمایت کے جرم میں ابن عطاء کو بھی موت کی سزا دی گئی۔ صوفیہ میں بالخصوص حضرت جنیدؒ کے حلقۂ ارشاد میں حکومت کے اس اقدام کے باعث جس نوعیت کی خاموشی اختیار کی گئی، اس کا مطلب یہ نہیں کہ بغداد میں اسلامی تصوف کے ابجد کی جو تحریک حضرت سری سقطیؒ نے پیدا کی، وہ ختم ہو گئی، البتہ احتیاط ضرور اختیار کر لی گئی لیکن اس کے باوجود صوفیہ کے خلاف جاہ طلب علماء اور سرکاری حکام کی تعزیری کارروائی ختم نہیں ہوئی اور حالت خوف کے بعد تصوف جو عشق کے مراحل میں داخل ہو چکا تھا اپنے عشق الٰہی

کے نظریے کی بدولت اور بھی زیادہ حکام کی نگاہوں میں کھٹکنے لگا تھا کیونکہ خدا سے انسان کے عشق کے نظریے کو بدعت قرار دینے میں بعض حلقے اتنے پیش پیش تھے کہ خدا سے عشق کے اظہار پر حکومت کی طرف سے پابندی لگا دی گئی اور صوفیہ کے روپ میں خفیہ پولیس کے آدمی صوفیانہ مجالس میں آنے جانے لگے۔

حضرت جنیدؒ کے ایک صوفی دوست حضرت سمنون رحمۃ اللہ علیہ اپنے زمانہ کے بے نظیر ولی تھے اور عشقِ الٰہی ان کا خاص موضوع تھا۔ تمام صوفی مرشد ان کے احوال اور مقامات کی تعریف کرتے تھے۔ وہ انہیں سمنون عاشق کے لقب سے یاد کرتے تھے۔ حضرت جنیدؒ ان کے عشقِ الٰہی کے عقیدہ سے متفق تھے کہ خدا اور انسان کے درمیان محبت کا تعلق قائم ہو سکتا ہے اور اہلِ تصوف کے اس نظریہ کی وضاحت ان الفاظ میں کرتے تھے کہ خدا اور انسان کے درمیان محبت کا تعلق قائم ہو سکتا ہے اور محبت ایک ایسی حالت ہے جو انسان اپنے دل میں محسوس کرتا ہے یہ اتنی پوشیدہ اور پُر از ابہام ہوتی ہے کہ اظہار و بیان میں نہیں آ سکتی وہ پوشیدہ حالت ایک عبادت گزار کو اللہ تعالیٰ کی عظمت کو پہچاننے میں مدد کرتی ہے اور اس کے اندر یہ آرزو پیدا کرتی ہے کہ انسان اللہ تعالیٰ کی رضا حاصل کرے اس میں اتنا شوقِ وابستگی بڑھ جاتی ہے کہ وہ ایک لمحہ کے لئے خدا کے ذکر و خیال سے غافل نہیں ہوتا، خدا کے بغیر کہیں چین نہیں پاتا اور اللہ تعالیٰ کے مسلسل ذکر میں اسے قلبی سکون ملتا ہے۔ لیکن انسان اور خدا کے درمیان اس رشتۂ محبت کے اندر جسمانی جذب و کشش اور وصل و وصول کی قسم کی کوئی چیز نہیں ہوتی اور یہ ہو بھی کیسے سکتا ہے اس لئے کہ خدا کا حقیقی معنوں میں بے پایاں وجود اتنا ارفع اور مقدس ہے کہ نہ اس تک پہنچا جا سکتا ہے نہ اسے حاصل کیا جا سکتا ہے اور نہ اس کا ادراک کیا جا سکتا ہے اور خدا سے محبت کرنے والے خدا پرست کی تعریف ان معنوں میں ہی ہو سکتی ہے کہ وہ محبوبِ حقیقی کے عشق میں پوری طرح کھو چکا ہو اور اس کے غلبے میں ہو۔

محبتِ الٰہی کے اس مسئلے پر صوفیہ کے افکار کو غلط معنوں میں لیا جا رہا تھا اور مروجہ دینی عقائد کے خلاف سمجھا جاتا تھا اس کے علاوہ مبتدیوں میں بھی اس نظریہ کے فہم میں ناکامی کے باعث غلط روی سرایت کر چکی تھی اور فتنہ انگیزوں کو ابھرنے کا موقع مل رہا تھا۔ چنانچہ صوفیہ پر یہ الزام بھی عائد کیا گیا کہ وہ غیر شرعی افکار اور توہم پرستانہ عقائد کا اظہار کرتے ہیں۔

حضرت سمنونؒ جو بے حد حسین و جمیل صوفی تھے اور خدا سے عشق کے مسئلے پر ان کے اشعار کی بڑی دھوم تھی اور جب وہ اس موضوع پر اظہارِ خیال کرتے تھے تو سننے والے اُن کے اسلوب اور دلکش لب و لہجہ میں گرفتار ہو جاتے تھے اور ان پر بھی وہی کیف و مستی چھا جاتی جو ان کے کلام کا خاصہ تھی ان کے دو صوفی دوست رقامؒ اور شہامؒ بھی اسی کیف و مستی میں عشق ہی کی باتیں کرتے تھے لیکن سمنونؒ کے حلقۂ ارشاد کے بارے میں حکومتی سطح پر نکتہ چینی شروع ہوئی تو اس دوران اُن کی ایک مریدنی اپنے حسین و جمیل مرشد کے عشق کی آگ میں جلنے لگی۔ وہ سمنونؒ کے حلقۂ ارشاد میں عرصہ سے شامل تھی اور حضرت سمنون کے عاشقانہ لب و لہجہ اور اظہار و بیان کی دلکشی نے اسے دیوانہ بنا دیا۔ لیکن حضرت سمنونؒ نے جب دیکھا کہ یہ مریدنی نفس کی خواہشوں میں الجھ گئی ہے تو انہوں نے اس مریدنی کو اپنے حلقۂ ارشاد سے نکال دیا۔ وہ مریدنی اپنے عشق میں ناکام ہو کر حضرت جنیدؒ کے پاس گئی اور پوچھنے لگی۔

”آپ کا اس شخص کے بارے میں کیا خیال ہے جسے میں نے عشقِ الٰہی کی تلاش کا ذریعہ بنایا لیکن خدا تو غائب ہو گیا اور وہ سامنے رہ گیا۔“

حضرت جنیدؒ اس کا مطلب سمجھ گئے اور اسے کوئی جواب نہ دیا۔ یہ عورت جس کے حکومتی سطح پر اعلیٰ حکام سے گہرے تعلقات بھی تھے دراصل حضرت سمنونؒ سے شادی کرنا چاہتی تھی اور جب وہ اپنے مقصد میں ناکام ہوئی اور حضرت سمنونؒ نے اسے شانِ بے نیازی سے مسترد کر دیا تو اس نے انتقام لینے کے لیے خلیفہ الموفق کے ایک درباری غلام الخلیل سے رابطہ قائم کیا۔ غلام الخلیل صوفیہ دشمنی میں بہت شہرت رکھتا تھا اور خلیفہ کے بہت قریب تھا اس کا عقیدہ تھا کہ انسان اور خدا کے درمیان کسی قسم کا عشق ناممکن ہے اور اللہ تعالیٰ کے متعلق عشق کا نظریہ بدعت ہے کیونکہ عشق صرف مخلوق ہی کی صفت ہے نہ کہ خالق کی، اور کسی کو یہ کہنے کا حق نہیں کہ مجھے خدا سے عشق ہے اور خدا کو مجھ سے۔ حضرت سمنونؒ کی مریدنی نے غلام الخلیل کو سمنونؒ اور اس کے ساتھیوں کے خلاف خوب بھڑکایا اور غلام الخلیل نے اس عورت کی درخواست اور دوسری شکایتوں کی بنا پر صوفیہ کے خلاف عدالت میں مقدمہ دائر کر دیا۔ دوسرے صوفیہ کو عدالت میں بلایا گیا اور ان پر الزام عائد کیا کہ یہ عشقِ الٰہی کے مسئلے پر بحث کرتے ہیں اس سلسلے میں حضرت جنیدؒ کو بھی عدالت میں طلب کیا گیا لیکن فقیہانہ رتبے کی بنا پر وہ عدالت میں حاضر ہونے کی پابندی سے مستثنیٰ قرار دیئے گئے لیکن کئی جید صوفیہ کو گرفتار کر لیا گیا اور بغداد میں اس مقدمے کو بڑی شہرت حاصل ہوئی۔ بغداد کے صوفیہ پر منصور حلاجؒ کو پھانسی دینے کے مقدمے کے پس منظر میں اور زیادہ الزامات عائد کئے گئے اور طرح طرح کی الزام تراشی کی گئی۔ مقدمہ کی سماعت کے دوران صوفیہ نے اپنے موقف سے قطعاً انحراف نہ کیا اور علمی اعتراضات کو سلوک و طریقت کے بارے میں کئے جانے والے اعتراضات کو گڈمڈ کر دیا گیا جس کے نتیجے میں قاضی کے استغاثہ کے دلائل کو درست مان کر یہ مقدمہ خلیفہ کے پاس منتقل کر دیا جو چیف جسٹس کی حیثیت رکھتا تھا۔ خلیفہ نے قاضی بغداد کی سفارش پر فیصلہ دیا کہ حضرت سمنونؒ سمیت ان تمام صوفیا کو قتل کر دیا جائے جو اس مقدمہ میں مجرم ثابت ہوئے چنانچہ صوفیہ کو قتل کرنے کے لیے مقتل میں لایا گیا اور جب جلاد نے قتل کرنے کے لئے خلیفہ سے آخری اجازت طلب کی تو خلیفہ کی زبان بند ہو گئی۔ کارروائی روک دی گئی اور رات کو خلیفہ نے خواب دیکھا کہ کوئی اسے کہہ رہا ہے کہ تیری حکومت کا زوال حضرت سمنونؒ کے ساتھ وابستہ ہے۔ خلیفہ گھبرا کر اٹھا اور صبح ہوتے ہی اس نے حضرت سمنونؒ اور ان کے رفقاء سے معافی مانگی اور انتہائی عقیدت کے ساتھ پیش آیا اور رہا کر دیا۔

حضرت داتا صاحبؒ نے حضرت سمنونؒ کے مرتبہ کے بارے میں فرمایا ہے کہ حضرت سمنونؒ حضرت جنیدؒ کے معتمد رفیقوں میں سے تھے اور عشقِ الٰہی کے سلسلے میں ان کے اشارات بہت دقیق اور کلام بہت ارفع ہے ایک مرتبہ وہ حجاز سے تشریف لا رہے تھے تو راستے میں ایک شہر والوں نے ان سے درخواست کی کہ وہ منبر پر تشریف فرما کر وعظ فرمائیں۔ حضرت سمنونؒ نے ان کی درخواست قبول کرتے ہوئے وعظ فرمایا تو انہوں نے کوئی توجہ نہ دی اس پر حضرت سمنونؒ نے اپنا رخ مسجد کی قندیلوں کی طرف پھیر کر فرمایا: ”اے قندیلو! میں تم سے مخاطب ہوں۔“ قندیلیں گریں اور چکنا چور ہو گئیں۔ حضرت سمنونؒ کا قول ہے کہ کوئی چیز لائقِ تعبیر نہیں، مگر وہ سب سے زیادہ باریک ہے اور محبت سے بڑھ کر کوئی چیز باریک نہیں جس سے اس کی تعبیر کی جا سکے۔“

صوفی حضرات اس مقدمہ سے بھی بری تو کر دیئے گئے لیکن دنیائے تصوف پر اس کے بڑے ناخوشگوار اثرات ہوئے۔ بہت سے صوفی عام زندگی سے بالکل الگ تھلگ ہو گئے اور حضرت جنیدؒ زیادہ ہی گوشہ نشین ہو گئے۔ اُن کا زیادہ وقت تنہائی میں گزرتا۔ تصوف کی محفلیں اُداس ہو گئیں اور بہت کم لوگ رہ گئے جو کھلے بندوں اس موضوع پر گفتگو کر سکتے تھے۔ اس ضمن میں حضرت ابوبکر شبلیؒ کے صوفیانہ اشارات بھی صوفیانہ طرزِ زندگی کے تسلسل میں عمومی زندگی پر اثر انداز ہوئے اور حضرت جنیدؒ کے حالاتِ زندگی اور طرزِ فکر کو سمجھنے میں حضرت ابوبکر شبلیؒ

بھی بڑی مدد کرتے ہیں جو حضرت جنیدؒ کے قابلِ قدر شاگردوں میں سے ایک ہیں۔

حضرت جنیدؒ کے اساتذہ، معاصرین اور شاگرد

حضرت ابوحفص عمر بن سالم نیشاپوری خراسان کے رہنے والے تھے۔ ان کے ابتدائی حالات کے مطابق آہنگری اُن کا پیشہ تھا۔ ایک لونڈی پر فریفتہ ہو گئے اور اسی کے خیال میں گم رہنے لگے تو ملنے جلنے والوں نے مشورہ دیا کہ نیشاپور کے ایک شہر میں ایک یہودی جادوگر ہے وہ تمہارے درد کا مداوا کر سکتا ہے۔ ابوحفص اس کے پاس گئے۔ یہودی نے علاج کی یہ صورت بتائی کہ علاج کے دوران چالیس دن تک نماز ترک کرنی ہوگی اور ساتھ ہی اللہ کا ذکر، نیکی کا عمل اور اچھا خیال تک چھوڑنا ہوگا تبھی میرے جادو کا اثر ہوگا۔ چنانچہ چالیس دن تک یہودی جادوگر عمل کرتا رہا لیکن ابوحفص کی آرزو پوری نہ ہوئی۔ یہودی نے اپنے عمل کی ناکامی پر یہ جواز پیش کیا کہ میرے عمل کی ناکامی کا باعث یقیناً تمہارا کوئی نیک عمل ہے جو تمہیں یاد نہیں لہٰذا سوچ کر بتاؤ کہ تم نے کون سا نیک عمل کیا ہے۔ ابوحفص نے کہا "میں نے کوئی نیکی نہیں کی اور نہ ہی ظاہر و باطن میں کوئی عملِ خیر کیا ہے البتہ ایک دن میں نے راستے میں پڑا ہوا ایک پتھر پرے کر دیا تھا کہ مبادا کسی کو ٹھوکر لگ جائے۔"

یہودی نے یہ سُن کر کہا۔ "مجھے افسوس ہے کہ تو نے چالیس دن میری ہدایت کی نافرمانی کی اور میرے عمل کو ضائع کر دیا مگر خدا نے تیری اتنی سی بھی نیکی رد نہ کی۔" اس پر ابوحفص نے توبہ کی اور اسی وقت وہ یہودی بھی مسلمان ہو گیا۔ کچھ دنوں بعد حضرت ابوعبداللہؒ باوردی سے ملاقات کی اور ان کے ہاتھ پر بیعت کی اور نیشاپور میں واپس آ گئے اور دکان پر بیٹھے کام کر رہے تھے کہ انہوں نے ایک نابینا کو قرآنِ پاک کی تلاوت کرتے دیکھا اور خود تلاوت سننے میں محو ہو گئے۔ محویت اتنی بڑھی کہ اپنے آپ میں نہ رہے اور اپنا ہاتھ لوہا گرم کرنے والی بھٹی میں ڈال دیا اور بغیر چمٹے کے گرم سُرخ لوہا بھٹی سے نکال لیا۔ شاگردوں نے یہ عالم دیکھا تو اُن کے ہوش اڑ گئے۔ جب ابوحفصؒ کی محویت ختم ہوئی تو اس پیشے کو ترک کر دیا اور کہا "میں دستکاری چھوڑی، پھر اس طرح لگا کر اس نے مجھے چھوڑ دیا۔" اس کے بعد پھر میں نے اس کی طرف کبھی رجوع نہ کی۔ حضرت ابوحفص نے ابوعبداللہ باوردیؒ کی صحبت سے فیض حاصل کیا اور صوفیائے کرام کے بزرگ اور سردار کہلائے۔

شجاع بادشاہ کرمان سے اُن کی زیارت کے لئے آئے تو بغداد میں صوفیائے کرام کی زیارت کر رہے تھے۔ عربی زبان سے واقف نہ تھے اور جب بغداد کے صوفی مرشدین سے ملے تو ان کی ملاقات حضرت جنیدؒ سے بھی ہوئی۔ اُن کے مریدوں کو خیال گذرا کہ یہ بڑے عجب کی بات ہے کہ بغداد کے مشائخ سے ملاقات کے لئے ترجمان کی ضرورت ہو۔ لیکن جب بغداد کی مسجد شونیزی میں مشائخؒ سے ملاقات ہوئی تو انہوں نے انتہائی فصیح عربی میں گفتگو کی اور سننے والے دنگ رہ گئے حالانکہ وہ عربی زبان سے ناآشنا تھے اور لوگ فصاحتِ کلام میں اُن کے سامنے عاجز آ گئے۔ مسجد میں ہر طرف سے اُن پر سوالوں کی بوچھاڑ شروع ہو گئی۔ حضرت ابوحفصؒ نے کہا۔

"ایک وقت میں ایک سوال۔" چنانچہ اُن سے سب سے پہلے پوچھا گیا۔

"سخا کیا ہے؟" حضرت ابوحفصؒ نے حاضرین سے مخاطب ہو کر کہا۔

"بہتر ہے کہ سب سے پہلے آپ میں سے کوئی اس کا جواب دے۔"

حضرت جنیدؒ نے پہل کی اور کہا۔ "میرے خیال میں سخا یہ ہے کہ انسان اپنے اس فعل کو خود کبھی سخا نہ سمجھے اور نہ کبھی اپنے آپ سے اس کا تذکرہ کرے۔"

ابوحفصؒ یہ سن کر بے اختیار بول اٹھے۔ "شیخ نے کیسی اچھی بات کہی ہے لیکن میری رائے میں سخا یہ ہے کہ دوسروں کے ساتھ ہمیشہ انصاف کیا جائے اور اپنے لئے کبھی انصاف طلب نہ کیا جائے۔" حضرت جنیدؒ نے اسی لمحے اپنے مریدوں کو ہدایت کی وہ ابوحفصؒ کی تعظیم کے لئے اٹھیں کیونکہ یہ "سخا کے معاملے میں حضرت آدمؑ اور اُن کی تمام اولاد سے بھی آگے بڑھ گئے ہیں۔" حضرت جنیدؒ کی ابوحفصؒ سے یہ ملاقات ایک ابدی تعلقِ خاطر میں ڈھل گئی۔ حضرت جنیدؒ ان کی بے پناہ توقیر کرتے تھے اور ان کے بارے میں اکثر دوستوں اور مریدوں سے کہا کرتے۔ "ابوحفصؒ ان لوگوں میں سے ہیں جو حقیقتِ الوہی کے معنوں کو سمجھتے ہیں اور ان سے صرف حل کرنی انسان مطمئن، کامیاب اور مالا مال ہو جاتا ہے وہ دل کی گہرائیوں سے باتیں کرتے ہیں اور ایک اکمل و کامل عالم ہیں۔ خراسان کے مرشد اور اسی طرح ان کے شاگرد رتبے میں بہت بلند ہیں۔"

حضرت ابوحفصؒ بے انتہا دولت مند تھے، وہ انتہائی قیمتی لباس پہنتے تھے جو ریشم کا ہوتا تھا اور خود اُن کا مکان اعلیٰ ذوقِ جمال کا آئینہ دار تھا۔ محققین کی رائے میں یہ چیزیں تصوف میں اونچے ذوق کی عکاسی کرتی ہیں اور ثابت کرتی ہیں کہ تصوف رہبانیت نہیں بلکہ زندگی کے معاملے میں ایک نرم اور اعتدال پسند طرزِ فکر اور طرزِ عمل کا نام ہے۔ حضرت ابوحفصؒ کو بغداد کے ان صوفیہ سے بہت اختلاف تھا جو راہبانہ رویہ رکھتے تھے اور حضرت جنیدؒ پر روحانی اور دنیاوی رویوں میں خراسان کے صوفیوں کے اعلیٰ معیار کا گہرا اثر بھی ہوا کیونکہ حضرت ابوحفصؒ سے پہلے حضرت جنیدؒ المحاسبیؒ ایسے جلیل القدر صوفی، محدث اور عالم کی صحبت میں ذوقِ راحت اور ذوقِ جمال کے شعور سے مزین ہو چکے تھے اور حضرت ابوحفصؒ کے اس رویے سے بھی انہوں نے گہرا اثر قبول کیا۔ یہ حضرت ابوحفصؒ کی شخصیت اور علمی گہرائی کے اثرات کا نتیجہ تھا کہ حضرت جنیدؒ انہیں اپنے ہاں لے آئے جہاں وہ اپنے آٹھ رفیقوں کے ساتھ ایک سال تک مقیم رہے۔ حضرت ابوحفصؒ اور ان کے رفیق، دینِ اسلام کے سچے پیروکار تھے اور اہلِ علم و فضل تھے اور علمی و تحقیقی دنیا کے مسائل پر ان کی گہری نظر تھی۔ اور ہر نئے علم و تحقیقی تجربے سے مالا مال تھے وہ جانتے تھے کہ جمال اور راحت جو عارضی چیزیں ہیں ان سے کیسے لطف اندوز ہوا جا سکتا ہے۔ لیکن اس کے باوجود وہ روحانی زندگی کی کامرانیوں سے سرفراز تھے اور توحید سے حقیقی رسائی نے ان میں ایسی کیفیتیں پیدا کر دی تھیں کہ بغداد کے صوفیہ کا حضرت جنیدؒ کے گھر مسلسل آنا جانا رہا اور حضرت جنیدؒ کے دل میں اُن کے لئے بے حد حساب عقیدت و احترام تھا وہ ہر روز اس قابلِ احترام مہمان کے لئے اعلیٰ سے اعلیٰ کھانے تیار کرواتے، اُن کے لئے لباس اور عطر کے انتظامات کرتے۔ حضرت ابوحفصؒ ایک سال تک حضرت جنیدؒ کے مہمان رہے اور جب جانے لگے تو حضرت جنیدؒ نے دوبارہ انہیں اور ان کے رفیقوں کے لئے نئے کپڑے بنوائے اور رخصت ہوتے وقت ابوحفصؒ نے کہا۔

"جب آپ نیشاپور تشریف لائیں تو ہم آپ سے بہت شرافت اور فیاضی سے پیش آئیں گے۔ جو کچھ آپ نے کیا وہ آپ کا خود عاید کردہ فرض تھا۔ اگر کبھی غرباء آپ کے پاس آئیں تو آپ اُن کے بارے میں پریشان نہ ہوا کریں اس لئے کہ جب آپ خود بھوک محسوس کریں گے تو انہیں بھی بھوک محسوس ہوگی اور جب آپ پُرباش ہو گئے تو وہ بھی اپنے آپ کو پُرباش محسوس کریں گے اور ان کے آنے سے آپ کو کبھی پریشانی نہیں اٹھانی پڑے گی۔"

حضرت جنیدؒ اور حضرت ابوحفصؒ کے درمیان اس عقیدت مندانہ تعلق کی وضاحت نہیں ہو سکتی۔ حضرت جنیدؒ جنہوں نے حضرت المحاسبیؒ سے جو ذوقِ جمال اخذ کیا تھا، اُسے حضرت ابوحفصؒ کے تصورِ جمال سے بڑی تقویت حاصل ہوئی۔ اور حضرت جنیدؒ نے عام صوفیہ کی طرح رہبانیت کی طرف مائل ہونے اور فقر و غنا کی بحث میں پڑنے کی بجائے روحانی ارتقاء پر بھی راسخ عقیدے کے ساتھ قائم رہے۔

حضرت ابوجعفر الکرنبی البغدادیؒ سے بھی حضرت جنیدؒ کو یک گونہ عقیدت تھی۔

اور بغداد کے زاہدوں اور عابدوں میں ان کی مقبولیت کا یہ عالم تھا کہ اس دور کے اہلِ فقر اُن کے رہن سہن کو اپنا سعادت سمجھتے تھے اور بغداد میں پیوند لگی گُدڑی سے بہت مشہور تھے۔ حضرت جنیدؒ انہیں استاد کا درجہ دیتے تھے اور اکثر اوقات اُن کے ساتھ بڑی خواہش سے تبادلۂ خیال کرتے تھے۔ ایک دن حضرت جنیدؒ نے ابن الکرنبیؒ سے سوال کیا۔

"اس شخص کے بارے میں آپ کی کیا رائے ہے جو علم کی باتیں تو بہت کرتا ہے لیکن عمل سے بیگانہ ہے؟" حضرت الکرنبیؒ نے جواب دیا۔

"گروہ شخص آپ ہوں تو بہتر ہے" حضرت جنیدؒ نے ایک دن بہت چاہا کہ اُن کی خدمت میں کچھ رقم پیش کریں لیکن حضرت الکرنبیؒ نے رقم قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ لیکن حضرت جنیدؒ کے اس خیال سے کہ رقم قبول کرنے سے ایک مسلمان کی دلجوئی ہو گی تو انہوں نے یہ رقم قبول کر لی۔

صوفیہ پر حکومت کی طرف سے جب سختیاں ہونے لگیں اور پکڑ دھکڑ شروع ہوئی تو وہ بغداد سے باہر چل دیئے۔ پولیس نے انہیں دُور سے دیکھا تو ایک صوفی سمجھ کر اُن کی طرف بڑھتے تو پیوند لگی گدڑی اور بڑھی ہوئی داڑھی کے ساتھ انہوں نے پاگلوں جیسی حرکتیں کرنا شروع کر دیں جس سے پولیس کو اُن پر پاگل ہونے کا گمان گزرا۔ اور گرفتار ہونے سے بچ گئے۔ حضرت جنیدؒ اُن کے علمی تصوف اور خلوصِ زہد سے بہت متاثر تھے اور ان کی زندگی شاگردوں اور دوستوں کے لئے نمونہ بنی ہوئی تھی۔ حضرت جنیدؒ کے ساتھ اُن کے مشفقانہ تعلق کا ایک اور ثبوت یہ بھی ہے کہ جب حضرت الکرنبیؒ جہانِ فانی سے رخصت ہو رہے تھے تو حضرت جنیدؒ اس موقع پر موجود تھے اور آسمان کی طرف دیکھ رہے تھے حضرت الکرنبیؒ نے کہا "بہت دُور دیکھ رہے ہو"

اس پر حضرت جنیدؒ نے آنکھیں نیچی کر لیں اور وقتِ رخصت الکرنبیؒ نے ایک مرتبہ اور یہی الفاظ دہرائے "بہت دُور دیکھ رہے ہو"

حضرت جنیدؒ کے ایک اور استاد حضرت ابو جعفر محمد ابن علی القصابؒ کا ذکر بھی حضرت جنیدؒ کے اقوال و افکار میں ملتا ہے اگرچہ حضرت جنیدؒ کی تحریروں اور ارشادات میں حضرت قصابؒ کے افکار کی جھلکیاں بہت کم نظر آتی ہیں لیکن حضرت جنیدؒ نے اُن سے عارفانہ اسرار و رموز کا فہم حاصل کیا۔ حضرت قصابؒ، تنہائی گوشہ نشین صوفی استاد تھے اور حضرت جنیدؒ انہیں اپنا استاد کہتے تھے۔ ایک مرتبہ حضرت جنیدؒ کی موجودگی میں اُن سے پوچھا گیا کہ آپ کے حلقے کے لوگ عام لوگوں سے الگ تھلگ کیوں رہتے ہیں؟ حضرت قصابؒ نے جواب دیا اس کے تین اسباب ہیں۔ پہلا یہ کہ اللہ تعالیٰ خود اس بات کو پسند نہیں کرتا کہ اس کے خاص دوستوں کے پاس بھی وہی کچھ ہو جو عام لوگوں کے پاس ہوتا ہے۔ اگر اللہ تعالیٰ یہ چاہے کہ اپنے خاص دوستوں کو بھی وہی چیز عطا فرمائے جو عوام کے پاس ہو تو پھر اُسے عوام پر بھی خصوصی فضل کرنا پڑتا ہے۔ دوسرا سبب یہ ہے کہ خدا یہ پسند نہیں کرتا کہ اس کے خاص بندوں کے نیک اعمال دوسرے لوگوں کے حساب میں لکھے جائیں۔ وہ اگر چاہتا تو انہیں عام لوگوں کی صحبت میں رہنے دیتا۔ تیسرا یہ کہ وہ ایک ایسے لوگوں کی جماعت ہیں جن کا مقصودِ حیات صرف اللہ تعالیٰ ہے اسلئے اللہ تعالیٰ اپنے سوا ہر چیز کو اُن سے روک دیتا ہے اور انہیں صرف اپنے لئے مخصوص رکھتا ہے۔

حضرت یحییٰ ابن معاذؒ جب پھرتے پھراتے بغداد آ گئے تو حضرت جنیدؒ پہلی ہی ملاقات میں اُن کے ہو کر رہ گئے اور ان کی صحبت میں جہاں بغداد کے اکثر زاہد و عابد اور طالبِ معرفت تبادلۂ خیال کے لئے آتے تھے وہاں حضرت جنیدؒ بھی ان کی محفل میں جاتے تھے

یحییٰ ابن معاذؒ جن کا حضرت بایزید بسطامیؒ سے گہرا تعلق تھا۔ معرفت میں اپنے علم و تجربے کی بدولت اللہ تعالیٰ کی امید پر ثابت قدم تھے۔ تمام زندگی سیاحت میں گزاری۔ کبھی کچھ پاس نہ رکھی اور منہ کی محققین کا خیال ہے کہ یحییٰ ابن معاذؒ ہی کے ذریعے بایزید بسطامیؒ کے افکار حضرت جنیدؒ تک پہنچے جن پر حضرت جنیدؒ کے تبصرے صوفیہ میں بڑے شوق سے پڑھے جاتے تھے اور اس سلسلے میں جب یحییٰ ابن معاذؒ بغداد سے تشریف لے گئے تو پھر بھی حضرت جنیدؒ نے خط و کتابت کے ذریعہ ان سے رابطہ قائم رکھا اور بعض پیچیدہ و مخفی مسائل پر مبنی اس خط و کتابت کو خاص اہمیت حاصل ہے جس سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ حضرت جنیدؒ بایزید بسطامیؒ کی روحانی قدر و منزلت کس خلوص سے کرتے تھے۔ وہ کہتے ہیں کہ بایزیدؒ ہم میں اسی مرتبہ کے حامل ہیں جو فرشتوں میں حضرت جبرائیل کا ہے؛ اور حضرت بایزید بسطامیؒ کا اپنے بارے میں یہ اظہارِ خیال اُن کے روحانی مرتبے کی تصدیق کرتا ہے "میرے اس لباس کے اندر سوائے خدا کے اور کوئی چیز نہیں" تاہم ان سے یہ اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ یحییٰ ابن معاذؒ کی صحبت اور ان سے خط و کتابت حضرت جنیدؒ کے لئے کتنی اہم رہی ہے درصوفی محققین حضرت یحییٰ ابن معاذؒ کو حضرت جنیدؒ کے اساتذہ میں شمار کرتے ہیں۔ حضرت داتا صاحبؒ فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے دو یحییٰ پیدا فرمائے ہیں، ایک انبیاء میں حضرت یحییٰ بن ذکریا علیہ السلام اور دوسرے اولیاء میں یحییٰ ابن معاذؒ۔ حضرت یحییٰ علیہ السلام خوفِ خدا کی راہ پر اس طرح قائم رہے کہ تمام اہلِ خوف نجات سے ناامید ہو گئے اور یحییٰ ابن معاذؒ اللہ تعالیٰ کی امید پر اس طرح قائم رہے کہ تمام اہلِ امید مایوس ہو گئے۔ حضرت داتا صاحبؒ فرماتے ہیں کہ یحییٰ ابن معاذ بصیرتوں کے والی تھے اور اُن سے کبھی کوئی کبیرہ گناہ سرزد نہ ہوا۔ اور طریقت کے معاملات میں اور ریاضت و مشقت میں اتنے کامل تھے کہ اُن جیسی طاقت کسی میں نہ تھی۔ وہ ہر حال صاحبِ عزت اور باوقار تھے۔

حضرت جنیدؒ کے معاصرین میں حضرت ابو یعقوب یوسف ابن الحسین رازیؒ ایک ایسے صاحبِ وقت اور بلند مرتبت صوفی تھے جو بغداد تشریف لائے تو حضرت جنیدؒ تصوف کے معاملے میں اُن کے غیر معمولی شعور و ادراک سے بڑے متاثر ہوئے۔ حضرت یوسف الحسین حضرت ذوالنون مصری ایسے صاحبِ الفقر استاد کے مرید تھے اور اُن کے صوفیانہ اقوال جن سے بصیرتیں روشن ہوتی ہیں، شعر و ادب کا انمول خزانہ ہیں اور اعلیٰ پائے کے نثر نگار اور ادیب تھے۔ فارسی داں ہوتے ہوئے بھی انہیں عربی زبان پر مکمل دسترس حاصل تھی۔ بغداد سے جانے کے بعد بھی خط و کتابت کے ذریعے حضرت جنیدؒ سے ان کا رابطہ قائم رہا اور حضرت جنیدؒ کے حلقہ احباب میں اُن کے خطوط کو بڑے شوق سے اور قدر سے پڑھا جاتا۔ محققین بتاتے ہیں کہ حضرت یوسف بن الحسینؒ کی تحریر و تقریر کا بنیادی حسن اُن کے شعور و احساس کی وضاحت کا عمل ہے کہ وہ فہم و ادراک کی کاملیت کو ہر حال میں برقرار رکھتے تھے اور الفاظ ان کے فکر کی راہ میں حائل نہیں ہوتے تھے وہ ہر مسئلے کو بڑی خوبصورتی اور حسنِ بیان کے ساتھ کھول کر بیان کر دینے میں قدرت رکھتے تھے اور ان کی ذہانت و بصیرت ہر لحاظ سے بے داغ تھی۔ ان کا کلام صوفیانہ ادب میں جامع اور اسلوب کے اعتبار سے دل نشین ہے۔ حضرت داتا گنج بخشؒ نے ان کے بعض اقوال بیان کئے ہیں اور ابن الحسینؒ نے حضرت جنیدؒ کے بارے میں اس رائے کا اظہار کیا ہے کہ وہ اپنے زمانہ کے اہلِ حکمت و معرفت کے سردار ہیں۔

حضرت جنیدؒ کے ایک اور رفیقِ فکر و نظر شیخ ابوبکر محمد بن مسلم عبد رحمان سقطرتیؒ جو حضرت معروف کرخیؒ، بشر بن حارثؒ کی روحانی اور علمی صحبتوں سے فیضیاب تھے۔ زہد و تقویٰ کے معاملات میں اتنے ہر دل عزیز تھے کہ جہاں جاتے انہیں آنکھوں پر بٹھایا جاتا اور ان کے کلام سے رہبری حاصل کی جاتی، مادی آسائشوں سے ہمیشہ بیزار رہے اکثر تنہا رہتے

عزت انہیں دل سے عزیز تھی حضرت جنیدؒ اُن سے باقاعدگی سے ملا کرتے تھے۔ ایک دن دوپہر کو حضرت جنیدؒ ان کے ہاں گئے تو حضرت سقطیؒ نے پوچھا کیا تمہارے پاس کوئی کام نہیں جو تم ایسے وقت یہاں آئے ہو؟ حضرت جنیدؒ نے کہا "اگر میرا یہاں آنا کام کی تعریف میں نہیں آتا تو میری رائے میں پھر کس چیز کو کام کا نام دیں!"

سب سے پہلے فنا و بقاء کا فہم عطا کرنے والے ابو سعید الخرازؒ حضرت جنیدؒ کے خاص دوستوں میں سے تھے اور حضرت سری سقطیؒ کے شاگردوں میں نمایاں مقام رکھتے تھے۔ ایک لحاظ سے حضرت جنیدؒ اور حضرت الخرازؒ ہم مکتب اور ہم خیال بھی تھے اور اتنے جانفشاں تھے کہ پورے بغداد میں ان کی نفس کشی اور ریاضت و مجاہدے کی بڑی دھوم تھی۔ دستکاری بھی کرتے تھے اور صوفیانہ علوم پر تحقیق و تصنیف میں بھی سب سے آگے تھے۔ حضرت جنیدؒ نے ایک مرتبہ اُن کی نفس کشی اور ریاضت کے بارے میں یہ خیال ظاہر کیا کہ اگر ہم سے خدا اس عمل کا تقاضہ کرتا جو خرازؒ کی کرتے ہیں تو ہم شاید اسی عمل کی کوشش میں تباہ ہو جاتے محفل میں سے کسی نے پوچھا۔

"خرازؒ کس قسم کا عمل کرتے ہیں؟"

حضرت جنیدؒ نے جواب دیا کہ "وہ اپنی کمند پر سالہا سال سے کام کرتے ہیں لیکن ایسا کبھی نہیں ہوا کہ ٹانکے اور ٹانکے کے درمیان خدا کا نام لینا بھول گئے ہوں!"

حضرت ابو سعید الخرازؒ صوفیانہ تجربوں کے امین تھے ان کے اقوال حضرت جنیدؒ کی تعلیمات حضرت جنیدؒ کے بعض قریبی شاگردوں کے ذریعے تصوف کے لٹریچر میں اضافہ کے طور پر شامل ہوئے ہیں اور پانچویں صدی تک مقبولیت کی انتہا پر تھے اور حضرت جنیدؒ کے مشرب کا ایک لازمی حصہ سمجھے جاتے ہیں۔ حضرت داتا صاحب کی شہرۂ آفاق تصنیف کشف المحجوب میں صوفیانہ معاملات کے حوالوں کے طور پر پیش کئے گئے ہیں۔

حضرت ابی محمد رُویم بن احمدؒ جن کے بارے میں حضرت جنیدؒ کی یہ رائے مقبولِ عام ہے کہ "ہم مشغول عارف ہیں اور حضرت رُویمؒ مشغول فارغ ہیں" (مطلب یہ کہ رُویمؒ ایسے شخص ہیں جو دنیا کے معاملات میں مشغول رہتے ہوئے بھی اپنا تعلق اللہ سے قائم رکھتے ہیں۔) حضرت جنیدؒ کے ابتدا میں قریبی دوستوں میں سے تھے۔ قرأت کی مہارت اور تفسیر میں صاحب کمال تھے اور علوم تصوف پر کئی کتابوں کے مصنف تھے تمام علوم ظاہری و باطنی میں ان کا کوئی ثانی نہیں تھا آخری ایام میں خلیفہ کے بہت قریب ہو گئے اور بغداد کی عدالت کے قاضی مقرر ہو گئے۔ حضرت جنیدؒ کو ان کا یہ فیصلہ ناپسند تھا۔

حضرت ابوالحسن علی بن محمد اصفہانیؒ کو صوفی محققین میں نمایاں مقام حاصل تھا اور مشاہدہ ومحاسبہ کی تحقیق اور اشارات انتہائی بصیرت افروز تھے ان کی ایک عرصہ تک حضرت جنیدؒ سے خط و کتابت رہی اور بعض مسائل پر حضرت اصفہانیؒ کی آرا کو حضرت جنیدؒ مستند قرار دیتے تھے اور ان کے خطوط اپنے شاگردوں کو پڑھواتے تھے پھر بحث و مباحثہ ہوتا اور اسرار و رموز سے پردے اٹھتے جاتے حضرت جنیدؒ کی پسندیدگی نے حضرت عمرو بن عثمان مکیؒ کو بھی اور وہ اتنے بیتاب ہوئے کہ ان کی زیارت کرنے اصفہان گئے۔ تسلیم و رضا کے معاملات میں اُن کی تحقیق رہنما اصولوں کی حیثیت رکھتی ہے۔

حضرت ابوالحسن محمد بن اسماعیل خیر النساجؒ اس زمانے میں امام طریقت کا درجہ رکھتے تھے۔ بڑے جلیل القدر صوفیہ نے ان سے فیض حاصل کیا حضرت شبلیؒ اور حضرت ابراہیم خواص نے انہی کی محفل میں توبہ کی اور اللہ کی جانب رجوع ہوئے۔ حضرت جنیدؒ ان کی دل سے قدر کرتے تھے۔ انہیں خیر النساجؒ اس لئے کہا جاتا ہے کہ ابتدا میں حج کے لئے روانہ ہوئے تو راستے میں کسی نے انہیں اپنا مفرور غلام سمجھ کر گرفتار کر لیا آپ نے حق سے روشنی حاصل کی کہ اللہ کی اسی میں رضا ہے اور سالہا سال تک اس شخص کی خدمت کرتے رہے ہر قسم کا ظلم برداشت کیا لیکن اُف تک نہ کی۔ چنانچہ ایک روز اس شخص پر انکشاف ہوا کہ اس نے غلطی سے حضرت خیر النساجؒ کو اپنا غلام سمجھ لیا ہے تو وہ بہت شرمسار ہوا اور جانے کی اجازت دے دی۔ حضرت خیر النساجؒ وہیں سے مکہ مکرمہ روانہ ہو گئے۔ اللہ تعالیٰ نے انہیں اپنے دوستوں میں خاص مقام بخشا۔ حضرت جنیدؒ ان کے بارے میں اپنے مریدوں سے کہا کرتے تھے۔

خیرنا خیرنا یعنی ہمارا خیر بہت اچھا ہے۔

جب حضرت خیر النساجؒ دنیا سے رخصت ہونے لگے تو شام کی نماز کا وقت تھا۔ موت کی بے ہوشی میں آنکھیں کھولیں تو ملک الموت کے سوا کچھ نظر نہ آیا اور کہنے لگے۔

"اے ملک الموت! ٹھہر جا۔ اللہ تمہیں معاف کرے یقیناً تو بھی فرماں بردار ہے اور میں بھی بندۂ فرماں بردار ہوں۔ جو تجھے حکم ملا ہے اسے تو ضرور بجا لائے گا یعنی میری جان ضرور نکالے گا لیکن مجھے جو حکم ملا ہے وہ ہر حال میں بجا لاؤں گا لہٰذا توقف کرتا کہ میں حکم الٰہی کی تعمیل کر سکوں۔ اس کے بعد تجھے جان نکالنے کی اجازت ہے۔" اس کے بعد انہوں نے وضو کے لئے پانی مانگا۔ وضو کے بعد نماز ادا کی اور جان دے دی۔ اسی رات لوگوں نے انہیں خواب میں دیکھا اور پوچھا۔

"اللہ تعالیٰ نے تمہارے ساتھ کیا کیا؟" کہنے لگے یہ سوال نہ کرو۔ لیکن میں نے تمہاری دنیا سے رہائی پا لی ہے۔" ان کا ایک قول بہت مشہور ہے "اللہ تعالیٰ نے متقیوں کے سینوں کو یقین کے نور سے بھر دیا ہے اور مسلمانوں کی آنکھوں کو ایمان کی حقیقت سے آشنا کیا ہے۔

حضرت ابوالعباس احمد بن محمد ابن مسروقؒ طوس کے رہنے والے تھے اور حضرت جنیدؒ کو ان سے ارادت اس بنیاد پر تھی کہ تمام اولیائے کرام زمین پر اُن کے ارشاد ہونے پر متفق تھے خراسان سے بغداد آئے تو حضرت جنیدؒ کی محبت نے انہیں وہیں روک لیا اور ان کے اشارات سے یہ اخذ کیا گیا ہے کہ وہ حضرت جنیدؒ کو قطب المدار سمجھتے تھے۔

حضرت ابو یزید بسطامیؒ اگرچہ بغداد کبھی تشریف نہیں لائے لیکن حضرت جنیدؒ ان کے افکار و احوال سے پوری طرح آگاہ تھے جو تمام مرشدین میں بلند مرتبے کے حامل تھے۔ حضرت ابو یزید بسطامیؒ کے بارے میں حضرت جنیدؒ کا ارشاد ہے۔ "صوفیائے کرام میں ابو یزید بسطامیؒ کی عظمت ایسی ہے جیسے فرشتوں میں حضرت جبرائیل علیہ السلام کی ہے!"

بلخ کے باعظمت بزرگ عبدالرحمٰن حاتم بن عنوانؒ جنہوں نے صوفیانہ زندگی میں نفسانی خواہشات کی تسخیر کے عملی راز ظاہر کئے، تمام زندگی صدق پر قائم رہے اور حضرت جنیدؒ ان کے بارے میں فرمایا کرتے تھے کہ "حاتمؒ ہمارے زمانہ کے صدیق ہیں۔"

حضرت جنیدؒ کے ایک اور رفیق حال حضرت ابوالحسن احمد بن نوریؒ رحمتہ اللہ علیہ جنہیں اب تک کے صوفیا نوریؒ کے لقب سے یاد کرتے ہیں اور ان کا نوری سلسلہ علمائے تصوف میں مقبول ہے خراسانی تھے اور حضرت سقطیؒ کے صحبت یافتہ تھے حضرت جنیدؒ اور حضرت نوریؒ کے دوستانہ مراسم انتہائی گہرے تھے۔ انہیں نوریؒ کا لقب اس لئے دیا گیا کہ جب کسی تاریک کمرے میں گفتگو کرتے تو سننے والوں کو یوں لگتا جیسے کمرہ روشنی سے منور ہو گیا ہے۔ حضرت نوریؒ کا خاص موضوع تزکیہ نفس تھا۔ انہوں نے نفس کے ضوابط اور مراحل کو ترتیب دیا۔ اور اپنے وجدان سے مریدوں کے حال جان لیتے تھے اس سلسلے میں حضرت جنیدؒ کے اس قول کو بڑی اہمیت حاصل ہے کہ "نوری لوگوں کے دلوں کی بات جانتا ہے۔" لیکن حضرت جنیدؒ کی طرح محتاط نہ تھے جب خلیفہ کے درباری غلام الخلیل کی کارروائی سے صوفیہ کو گرفتار کیا گیا تو انہیں بھی حقیقت دین کے اظہار کی پاداش میں دھر لیا گیا۔ غلام الخلیل نے رقامؒ اور

بُمزہ سمیت ان پر بھی زندیق ہونے کا الزام لگایا اور خلیفہ سے سفارش کی کہ انہیں قتل کر دینے سے زندیقوں کا خاتمہ ہو جائے گا۔ خلیفہ نے سر اڑانے کا حکم دیا۔ جلاد نے مقتل میں سر اڑانے کے لئے تلوار اٹھائی اور تینوں صوفیہ کے ہاتھ پُشت پر باندھے اور پہلے رقامؒ پر تلوار اٹھانے لگا تو حضرت نوریؒ جلدی سے آگے آئے اور رقامؒ کی جگہ تلوار کی زد میں آ گئے۔ دیکھنے والے حیران ہو گئے۔ جلاد نے کہا "اے جوانمرد! یہ تلوار ایسی نہیں کہ اسے کھیل سمجھا جائے اور تم اس تلوار کے سامنے کیوں آ گئے ہو حالانکہ تمہاری باری نہیں آئی" حضرت نوریؒ نے جواب دیا۔

"تم نے درست کہا لیکن میرا طریقہ ایثار پر مبنی ہے۔ دنیا میں سب سے زیادہ عزیز چیز زندگی ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ زندگی کے باقی سانس بھی اپنے بھائیوں پر قربان کر دوں۔ میرے نزدیک دنیا میں ایک سانس لینا آخرت کے ہزار سال سے بہتر ہے کیونکہ دنیا خدمت کی جگہ ہے اور آخرت قربت کی اور قربت خدمت کر کے ہی حاصل ہوتی ہے" خلیفہ کو اس کی اطلاع دی گئی تو وہ ان کلمات سے بے حد متاثر ہوا۔ اور حکم دیا کہ سزا کو ملتوی کر دیا جائے۔ چنانچہ مقدمہ قاضی ابوالعباس کے سپرد کر دیا گیا اور بعد میں شریعت و طریقت کے احکام میں تسلی کرنے کے بعد انہیں رہا کر دیا گیا لیکن حضرت نوریؒ رہائی کے چند دنوں بعد خالق حقیقی سے جا ملے۔ ان کی موت پر حضرت جنیدؒ نے کہا "نوریؒ کی موت کے بعد کسی شخص نے بھی حقیقت لازم کے بارے میں گفتگو نہیں کی" اور وصیت کی کہ انہیں بھی نوریؒ کے پہلو میں دفن کیا جائے لیکن یہ وصیت پوری نہ کی گئی۔

حضرت نوریؒ کی ایک حکایت ہے کہ ایک مرتبہ انہوں نے مسلسل تین دن اور تین راتیں اپنے گھر میں کھڑے ہو کر شور و غل کیا۔ لوگوں نے حضرت جنیدؒ کو خبر دی۔ وہ فوراً نوریؒ کے ہاں پہنچے اور کہنے لگے "اے ابوالحسن! اگر اس شور و غل میں کوئی فائدہ ہے تو مجھے بھی بتاؤ تاکہ میں بھی شور و غل کروں۔ اگر کوئی فائدہ نہیں تو اپنے دل کو رضائے الٰہی کے حوالے کر دو تاکہ تمہارا دل مطمئن ہو جائے" یہ سُن کر نوری خاموش ہو گئے اور کہنے لگے "اے ابوالقاسم! آپ کتنے اچھے رہنما ہیں"۔

حضرت ابوعثمان سعید بن اسمٰعیل حیریؒ کی اولیا کے دلوں میں بڑی محبت تھی اور انہوں نے شاہ شجاع کرمانی اور ابوحفصؒ جیسے اکابرین سے فیض حاصل کیا۔ تصوف میں ادب پر ان کی بے شمار کتابیں ہیں اور حضرت ابوحفص کے ساتھ ہی بغداد آئے تو حضرت جنیدؒ کی صحبت میں طویل عرصہ تک رہے۔ حضرت حیریؒ کا قول ہے کہ اللہ تعالیٰ جسے معرفت سے نوازے اس پر لازم ہے کہ وہ اپنے آپ کو گناہوں سے آلودہ نہ کرے۔

حضرت ابوعبداللہ احمد بن یحییٰ بن جلالؒ جن کی عارفانہ سیرت اور صوفیانہ اشارات حضور حق کی جد و جہد میں رہنما اصولوں کی حیثیت رکھتے ہیں، حضرت جنیدؒ کے حلقہ ارشاد سے منسلک تھے۔ صوفیانہ رسوم میں غیر مبہم وقتوں کے حامل حضرت ابومحمد احمد بن الحسین جریریؒ جنہیں حضرت جنیدؒ کے بھیدوں کا آشنا کہا جاتا ہے تمام علوم میں ماہر تھے اور تصوف میں انہیں درجۂ کمال حاصل تھا۔ ان کا ایک قول ہے "پسند کرنا، پرہیز کرنا اور غذا کی حفاظت کرنا۔ جس نے خدا کو پسند کیا اس کا ظاہر و باطن درست ہو گیا جس نے خدا کی منع کردہ چیزوں سے پرہیز کیا اس کی سیرت بے داغ ہو گئی، اور جو ناموافق چیزیں کھانے سے محفوظ رہا اس کی طبیعت درست رہی۔ لہٰذا پسندیدگی کا پھل معرفت ہے، پرہیز کا نتیجہ عمدہ خلق ہے اور غذا میں احتیاط تندرستی کی حفاظت ہے" حضرت جنیدؒ کی شاگردی پر انہیں فخر تھا۔ حضرت جنیدؒ کی غیر موجودگی میں شاگردوں کو درس دیتے تھے اور حضرت جنیدؒ نے ایک مرتبہ ان سے کہا "میرے شاگردوں کو تم ہی تصوف سکھایا کرو۔ اور ان کی تربیت کرو" حضرت جنیدؒ جب دنیا سے رخصت ہونے لگے تو آپ کے شاگردوں نے کہا۔ یا مرشد! آپ کے بعد آپ کا جانشین کون ہو گا؟ حضرت جنیدؒ نے ابومحمد الجریریؒ کا نام لیا۔ چنانچہ جریریؒ نے مسندِ جنید سنبھالی اور جنیدؒ کے حلقہ ارشاد سے منسلک طالب علموں کو تعلیم دینا شروع کر دی۔ آخری مرتبہ وہ حج پر گئے تو حجاز میں مکہ کی شاہراہ پر جنگل میں چلے گئے۔

ابوسعید ابن العربیؒ اور محمد جعفر الخلدیؒ

حضرت جنیدؒ کا طریقِ تعلیم بھی حضرت سری سقطیؒ کی طرح کا تھا۔ وہ بھی اپنے مریدوں کو زبانی درس دیتے تھے جو بحث و مباحثہ یا سوالات کی شکل میں ہوتا تھا۔ یہ بھی حقیقت ثابت ہوتی ہے کہ بعض صوفی مرشدین کی طرح انہوں نے کوئی باقاعدہ کتاب تصنیف نہیں کی ان کے جو اقوال اور تعلیمات صوفیانہ لٹریچر میں محفوظ ہیں یا ان کے عقائد و نظریات کے جتنے حوالے ملتے ہیں وہ ان کے خطوط اور رسائل سے اخذ کئے گئے ہیں۔ لیکن حضرت جنیدؒ کے افکار و نظریات کا زیادہ تر حصہ ان کے دو قریب ترین شاگردوں کی لکھی ہوئی کتابوں کے ذریعے اس عہد تک پہنچا ہے۔ اس کے علاوہ حضرت جنیدؒ کے شاگرد اس قیمتی سرمایہ کو نسلاً بعد نسلٍ آگے منتقل کرتے رہے ہیں۔ حضرت جنیدؒ کے ان دونوں قریب ترین شاگردوں ابوسعید بن احمد اور محمد جعفر الخلدیؒ میں جو بہت بڑے انشاپرداز اور ادیب بھی تھے لیکن اس سے بڑھ کر صوفی محدث اور فقیہہ بھی تھے حضرت جنیدؒ حلقۂ ارشاد میں جو کچھ بیان فرماتے اسے دونوں شاگرد اپنے طور پر قلمبند کر لیتے۔ حضرت جنیدؒ کے ان قابل قدر شاگردوں میں ابن العربیؒ اور الخلدیؒ کے نام بہت نمایاں ہیں۔

ابوسعید ابن العربیؒ جو بغداد ہی کے رہنے والے تھے، حضرت جنیدؒ کی روحانی قیادت کا اعتراف کرتے ہوئے لکھتے ہیں "تمام صوفیا کے آخر میں حضرت جنیدؒ آئے اور ان کے بعد پھر کوئی ایسا قابلِ ذکر صوفی نظر نہیں آتا" ابن العربیؒ کو یہ مقام حاصل ہے کہ ان کے ذریعے جنیدِ صوفیانہ افکار و نظریات مغربی دنیا کے گوشے گوشے میں پہنچے۔

حضرت جنیدؒ کی وفات کے بعد وہ بغداد سے حجاز چلے گئے جہاں شیخ حرم کے عہدے پر فائز ہوئے۔ مکہ مکرمہ میں انہیں دینی رہنما کا مرتبہ حاصل تھا اور تیس سال تک وعظ و ارشاد فرماتے رہے۔ مکہ مکرمہ جہاں دنیا کے ہر حصے سے طالبانِ علم اور زائرین آتے تھے، ابن العربیؒ کے حلقہ ارشاد سے بہت کچھ سیکھ کر واپس جاتے۔ علم حدیث میں انہیں بہرۂ وافر حاصل تھا اور علم حدیث کی اشاعت و فروغ کے ساتھ ساتھ انہوں نے استادِ تصوف حضرت جنیدؒ سے جو باطنی علوم اور تجربے حاصل کئے تھے انہیں بھی عام کیا۔ چنانچہ افریقہ اور ہسپانیہ تک ان کے شاگرد موجود تھے اور مدرسۂ بغداد کے مذہب کو آگے منتقل کر رہے تھے۔ ابن العربیؒ کی تصنیف کا اس وقت دنیا بھر میں شہرہ تھا اور مغربی عالموں اور فلسفیوں کے لئے غور و فکر اور تحقیق و تجسس کے دروازے کھولنے والا بھی وہی علم و تجربہ تھا جسے ابن العربیؒ نے حضرت جنیدؒ کے حلقۂ درس سے سیکھا تھا اور محققین نے حضرت جنیدؒ کے اقوال و افکار اور حالاتِ زندگی ابن العربیؒ کی تصنیف طبقات النساک ہی سے مرتب کئے ہیں۔

ابومحمد جعفر الخلدیؒ جو حضرت جنیدؒ کے عزیز ترین شاگرد تھے ابتدا میں محدث کے طور پر سامنے آئے۔ انہوں نے اپنے وقت کے کئی جلیل القدر محدثین سے احادیث کے انتخاب کا ہنر سیکھا اور مشاہیر صوفیہ کے اقوال و حالات جمع کرنے کے شوق میں تصوف کی طرف ایسے مائل ہوئے کہ حضرت جنیدؒ کے حلقہ ارشاد کے ہو کر رہ گئے۔ انہیں معاملاتِ تصوف کا بے پناہ فہم حاصل تھا اور حضرت جنیدؒ ان سے بے پناہ پیار کرتے تھے۔ حضرت جنیدؒ کی بے پایاں شفقت اور محبت کے زیرِ اثر الخلدیؒ نے اپنے مرشد کی زندگی کے حالات و تفصیلات مرتب کرنا شروع کر دیں۔ روزانہ جو کچھ بھی حضرت جنیدؒ ارشاد فرماتے الخلدیؒ اسے قلم بند کر لیتے۔ حضرت جنیدؒ

کے طریقہ عبادات، طرزِ تعلیم اور عام زندگی کی مصروفیات کو الخلدیؒ نے انتہائی سلیقے سے مرتب کیا اور آنے والی نسلوں کے لئے حضرت جنیدؒ کی شخصیت و کردار اور افکار و اقوال کو محفوظ کر دیا۔ الخلدیؒ کی اس تصنیف کا نام "حکایات الاولیاءؒ" ہے جو نہ صرف حضرت جنیدؒ کے بارے میں مستند معلومات فراہم کرتی ہے بلکہ بغداد کے مدرسۂ تصوف کے حضرت معروف کرخیؒ اور حضرت سری سقطیؒ کے بارے میں اہم دستاویز کی حیثیت رکھتی ہے۔

طبقات النساک اور حکایات اولیاء دنیائے تصوف میں مستند تسلیم کی گئیں اور بعد میں صوفیانہ لٹریچر کا بنیادی ماخذ ثابت ہوئیں۔ اب ان کتابوں کے حوالے ملتے ہیں لیکن یہ دونوں کتابیں محفوظ نہیں ہیں تاہم ان کتابوں کے اقتباسات پر مبنی صوفیانہ لٹریچر کے ذریعے معلوم ہوتا ہے کہ یہ دونوں کتابیں تیسری صدی ہجری کی انقلابی صوفی تحریک کا ایک اہم حصہ ہیں۔ یہی کتابیں صوفیاء کے انفرادی حالات اور ان کے صوفیانہ نصاب کے بارے میں معلومات فراہم کرتی ہیں۔

[illegible] جن صوفی مصنفین نے حضرت جنیدؒ کی نظریاتی تعلیمات اور ان کے حالاتِ زندگی کو اپنی تصانیف کا موضوع بنایا ان میں ابو نصر عبداللہ ابن علی السراجؒ کا نام بہت نمایاں ہے۔ سراجؒ، الخلدیؒ کے شاگرد تھے اور سراجؒ نے جو کچھ اپنے دادا مرشد حضرت جنیدؒ کے بارے میں اپنی تصنیف کتاب اللمع میں جمع کیا ہے وہ الخلدیؒ سے سن کر لکھا ہے۔ اس کے علاوہ بعد کی نسل میں سے ابو طالب المکیؒ، شاگردِ ابن العربیؒ، ابوبکر محمد بن اسحٰق الکلاباذیؒ، ابو عبدالرحمن محمد ابن الحسینؒ ابن موسیٰؒ، حافظ ابو نعیم احمد ابن عبداللہ الاصفہانیؒ، الحافظ ابوبکر احمد ابن علی الخطیب البغدادیؒ، علامہ قشیریؒ اور داتا علی ہجویریؒ ایسے جلیل القدر صوفیاء نے حضرت جنیدؒ کی صوفیانہ نظریاتی تعلیمات کے چراغ روشن رکھے۔ بغداد کا یہ مدرسۂ تصوف اس وقت اگرچہ حکمرانوں کے عتاب کا نشانہ بھی بنا لیکن حضرت جنیدؒ نے جس مکتبۂ فکر کی بنیاد رکھی وہ ٹھوس اصولوں پر قائم تھی اور حضرت جنیدؒ کے مرید تصوف کی جدید تحریک کو دور دور تک لے گئے۔ [illegible] نے تمام قدیم و جدید صوفیانہ افکار کو یکجا کر دیا۔ حضرت جنیدؒ کے شاگرد ابن العربیؒ کے ایک شاگرد مکی نے لکھا ہے کہ ہمارے استاد ابن العربیؒ نے اپنی کتاب طبقات النساک کا آغاز اس شخص سے کیا جس نے علمِ تصوف رائج کیا اور آخر میں اس شخص کا ذکر کیا جس نے تصوف کا آخری درس دیا اور وہ حضرت جنیدؒ تھے۔ انہیں وسعتِ نظر، صدقِ مقالی اور اظہار و بیان کی اعلیٰ صفات ودیعت ہوئی تھیں اور ان کے بعد ہم اس سلسلے میں کسی اور کا نام لیتے ہوئے ہچکچاتے ہیں۔

حضرت ابوبکر شبلیؒ

حضرت شبلیؒ دنیائے تصوف میں اپنے الگ تھلگ صوفیانہ رویے اور روحانی کیفیات کے اظہار میں منفرد ہونے کی حیثیت سے بہت معروف ہیں۔ بغداد کے مدرسۂ تصوف پر جو عتاب نازل ہوا اس دوران وہ بھی ملامت اور تنقید کا نشانہ بنے لیکن اپنی مخصوص صوفیانہ روش پر قائم رہے۔ حضرت شبلیؒ جو حضرت جنیدؒ کے انتہائی قابلِ ذکر مریدوں میں سے تھے۔ ابتداء میں خلیفۂ وقت کی طرف سے نہاوند کے علاقے کے ایڈمنسٹریٹر مقرر تھے لیکن طبیعت کے رجحان کے ہاتھوں مجبور ہو کر ملازمت ترک کر دی اور بغداد کے صوفی نساجؒ کے پاس آ گئے۔ جہاں انہوں نے فقر اختیار کرنے کی خواہش کا اظہار کیا۔ نساجؒ ان کی طبیعت کی سرگرمی اور پُرجوش اندازِ فکر و عمل سے آشنا تھے۔ انہوں نے حضرت شبلیؒ کو حضرت جنیدؒ کی خدمت میں بھیج دیا۔ حضرت جنیدؒ نے انہیں حلقۂ ارشاد میں داخل ہونے کے لئے ایک سال تک انتظار کرنے کے لئے کہا۔ پورے ایک سال نہاوند کے سابق ایڈمنسٹریٹر نے صبر و تحمل سے انتظار کیا اور سال ختم ہونے کے بعد دوبارہ آئے تو حضرت جنیدؒ نے انہیں ایک سال کے لئے دریوزہ گری کی ہدایت کی تاکہ دل کا میل اتر جائے۔ شبلیؒ نے یہ سال بھی دریوزہ گری میں گزارا اور حضرت جنیدؒ نے انہیں ایک نظر دیکھا تو شبلیؒ پوری طرح فقر کے سانچے میں ڈھل چکے تھے۔ رفتہ رفتہ ان کی یہ حالت ہو گئی کہ توحیدِ الٰہی کے عشق میں اپنے وجود کے احساس و شعور سے بھی عاری ہو گئے۔ ان کی باتیں اور حرکتیں بغداد میں مشہور ہو گئیں۔ کبھی وہ اللہ کا نام لینے والوں کو اپنی مدرسہ میں سے اٹھوا کر نکال دیتے اور کبھی اللہ کا نام لینے والوں کو قتل کرنے پر آمادہ ہو جاتے۔ ایک دن ہاتھ میں آگ لئے جا رہے تھے کسی نے پوچھا تو کہنے لگے "خانہ کعبہ کو جلانے جا رہا ہوں تاکہ لوگ خانہ کعبہ کے مالک کی طرف رجوع کر لیں"۔ عید کے دن سیاہ کپڑے پہن لیتے، وہ کہتے "میں اللہ کی ذات میں گم ہو گیا ہوں"۔ لوگ دیوانہ سمجھنے لگے اور بچوں نے ایک مرتبہ اتنے پتھر مارے کہ لہو میں شرابور ہو گئے۔ لوگ ڈر کے مارے دور کھڑے ہو گئے اور پھر لوگوں کو قریب بلایا اور کہا "میرے پاس آؤ اور سنو"۔ لوگوں نے ان کے کان اور سر سے بہتے ہوئے خون کے قریب اپنے کان کئے تو لہو کی ہر بوند سے اللہ اللہ کی آوازیں آ رہی تھیں۔ حضرت جنیدؒ کو کسی نے بتایا کہ شبلیؒ برسرِ عام حقائق کی باتیں کرتے ہیں۔ حضرت جنیدؒ نے انہیں سختی سے ڈانٹا کہ وہ ایسی باتیں نہ کریں۔ لیکن شبلیؒ کا جوش ٹھنڈا نہ ہوا۔ وہ راتوں کو بیدار رہتے اور عبادت کرتے۔ نیند کا غلبہ ہوتا تو آنکھوں میں نمک کی سلائی ڈال لیتے۔ اپنی خلافِ وضع باتوں سے انہیں سرکاری سطح پر دیوانہ قرار دے کر پاگل خانے میں بند کر دیا گیا۔ حضرت جنیدؒ کو اس کا گہرا صدمہ ہوا۔ پاگل خانے میں ان کی ملاقات ایک عباسی وزیر سے ہوئی جو پاگل خانے کا دورہ کرنے آیا تھا۔ اس نے شبلیؒ سے چند باتیں کیں تو اس نے اسی وقت اس خیال سے رہائی کا حکم دیا کہ کہیں ان کے جلال سے اس پر کوئی آفت نہ آ جائے۔ لوگوں نے ان پر یہ بھی الزام عائد کیا کہ شبلیؒ مسجد میں نماز ادا نہیں کرتے اور پورا کلمہ نہیں پڑھتے۔ اسی دوران ایک نوآموز درویش سے ان کی عشقِ الٰہی کے بارے میں بات چیت ہوئی تو وہ نوجوان درویش ان کی نگاہ کی تاب نہ لا سکا اور اسی وقت انتقال کر گیا۔ نوجوان درویش کے لواحقین نے شبلیؒ کے خلاف مقدمہ دائر کر دیا اور جب خلیفہ کے سامنے پیش کیا گیا تو دورانِ گفتگو خلیفہ کی حالت غیر ہونے لگی۔ اس نے سب کو مخاطب کرتے ہوئے کہا اگر شبلیؒ تم سب سے مخاطب ہوں تو تمہارا انجام بھی اس نوجوان درویش کی طرح ہوگا۔

شبلیؒ کی کیف و مستی کے افسانے مشہور ہو گئے تھے۔ ایک روز جوش و مستی میں دریائے دجلہ میں کود گئے اور پھر ایک روز خود کو پہاڑ سے گرا دیا۔ لوگوں نے پوچھا تو کہنے لگے "میں دائمی وصال چاہتا ہوں"۔ دائمی وصال کے شوق میں انہوں نے خود کو آگ میں جلانے کی کوشش کی، جنگلوں میں جا کر اپنے آپ کو درندوں کے سامنے پھینک دیا اور آواز آئی "شبلیؒ جو اللہ کی نگاہ میں پسندیدہ ہے اسے کوئی گزند نہیں پہنچ سکتی"۔ شبلیؒ عالمِ پریشانی میں مرشد کے پاس آئے۔ حضرت جنیدؒ نے انہیں کچھ دیر دیکھا اور کہنے لگے۔

"شبلی تمہیں کیا ہو گیا ہے؟"

شبلیؒ نے جواب دیا "میں زیادہ دیر انتظار نہیں کر سکتا اور انتظار کے راستے دشوار ہیں۔ خدا کے لئے مجھے سمیٹ لیں ورنہ میں بکھر جاؤں گا"۔ حضرت جنیدؒ ان کی سرشاری و مستی کے بارے میں فکرمند تھے۔ اُن کا ارشاد ہے "شبلیؒ ہمیشہ سرشاری رہتا ہے"۔ اگر وہ کچھ ہوش میں رہنے لگے تو ایک ایسا امام ثابت ہو سکتا ہے جس سے ایک خلق کو فائدہ پہنچ سکتا ہے۔

ایک دن شبلیؒ بازار میں سے گزر رہے تھے کہ کسی نے کہا "دیکھو وہ دیوانہ جا رہا ہے"۔ شبلیؒ یہ سن کر رک گئے اور کہا "تم سمجھتے ہو میں دیوانہ ہوں اور میں سمجھتا ہوں کہ تم بہت ہوشیار ہو۔ خدا مجھے دیوانہ کرے اور تمہیں ہوشیار بنائے"۔ اسی طرح ایک روز شبلیؒ بہت مضطرب تھے اور حضرت جنیدؒ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ حضرت جنیدؒ خاموش اور گہری فکر میں گم تھے

شبلیؒ نے پوچھا "کیا بات ہے مرشد! آپ خاموش ہیں: حضرت جنیدؒ نے جواب دیا۔
"جو تلاش کرتا ہے وہی پاتا ہے:"
شبلیؒ نے فوراً کہا: "نہیں، جو پالیتا ہے وہی دراصل تلاش کرتا ہے:"
حضرت شبلیؒ جنہیں اپنے مرشد سے بے پناہ ارادت تھی اور انہی کے فیض سے فقر میں کامیاب ہوئے تھے۔ اپنے اشارات اور مختصر اظہارِ بیان میں بہت مقبول تھے اور منصور حلاجؒ کے معاملے میں جب انہیں ملوث کیا گیا تو یہ فوراً الگ ہو گئے اگرچہ سرشاری و مستی کی وجہ سے ظاہری امور کی انجام دہی میں معذور تھے لیکن صوفیانہ مراحل کی نشاندہی میں کامل دسترس رکھتے تھے ان کا حال اور مقام ایک جیسا تھا [illegible] میں اُن کا انتقال ہوا اور بغداد میں ان کا مزار صدیوں سے مرکز شرق بنا ہوا ہے۔ ان کا مزار بغداد کے محلہ عظیمیہ میں ہے۔

آخری سفر

بغداد کے مدرسۂ تصوف پر پے درپے حملوں اور شدید عوامی ردِ عمل سے صوفیہ کو جن ناخوشگوار حالات کا سامنا کرنا پڑا، اس سے لوگوں میں تصوف کے متعلق ان گنت شکوک و شبہات پیدا ہوئے اور حضرت جنیدؒ جنہوں نے تمام زندگی حقیقت آگہی کا درس دیا اور تصوف کو قرآن و سُنت کے تابع رکھنے کے لئے جو انقلابی کردار ادا کیا، اس سے اسلامی تصوف کی تحریک ایک جامع ضابطے کی شکل تو اختیار کر گئی لیکن اُس دَور میں تصوف کی جانب لوگوں کا رجحان نسبتاً کم ہو گیا۔ جس کی بنیادی وجہ صوفیہ کا بے باکانہ اظہار تھا اور اس کے ردِ عمل میں صوفیہ کو موت کی سزا دی گئی اور بہت سوں کو قید و بند کی سختیاں اٹھانا پڑیں۔ حضرت جنیدؒ کے بارے میں جو معلومات اس دَور کے صوفیانہ لٹریچر کے ذریعے سامنے آتی ہیں اُن سے پتا چلتا ہے کہ حضرت جنیدؒ زیادہ ہی گوشہ نشین ہو گئے تھے۔ اور اپنے آپ کو تنہا محسوس کرنے لگے تھے۔ وہ خاص فضا اور ماحول جس میں حضرت جنیدؒ صوفیہ کو درس دیا کرتے تھے، روبہ زوال تھی اور معرفتِ الٰہی کا ذوق اتنا مستحکم اور عام نہیں تھا۔ ایک خط میں حضرت جنیدؒ فرماتے ہیں۔

"وہ محفلِ علم جس کا اب صرف ذکر رہ گیا ہے عرصہ ہوا ختم ہو گئی ہے اور اب تو تم محض اس علم کے حواشی کی باتیں کرتے ہیں۔ میں نے برسوں لوگوں کے ساتھ ایسے علم کے بارے میں گفتگو اور تبادلۂ خیال کیا جسے میں پہلے نہیں جانتا تھا اور اس سے مکمل طور پر ناآشنا تھا۔ میں نے اس علم کے حاصل کرنے میں کبھی اپنے طبعی رجحان کی مخالفت نہیں کی اور یہ بھی صحیح ہے کہ میں نے ایسے علم کو اچھی طرح سمجھے اور جانے بغیر قبول نہیں کیا اور نہ ہی اس پر بغیر سوچے سمجھے فریفتہ ہوا۔ گذشتہ زمانے میں ہم لوگ جمع ہو کر آپس میں اس متنوع اور ہفت پہلو علم کے بارے میں گفتگو کرتے تھے لیکن آج اس کی حالت یہ ہے کہ نہ کوئی اس کی پروا کرتا ہے اور نہ مجھ سے اس کے بارے میں کوئی سوال کرتا ہے۔"

حضرت جنیدؒ کے اس خط کے اقتباس سے یہ اندازہ لگانا کوئی مشکل نہیں کہ حضرت جنیدؒ کے ابتدائی زمانہ میں تصوف کی طرف لوگوں کا عام رجحان تھا لیکن حضرت جنیدؒ کے آخری ایام میں اس علم کے لئے لوگوں میں سنجیدگی اور خلوص ختم ہو گیا تھا۔ تاہم سیاسی سطح پر صوفیہ کے خلاف الزام تراشیوں کے باوجود حضرت جنیدؒ نے حقیقت الٰہی کے طالب علموں کی جو کھیپ تیار کی، وہ ایک تحریک بن کر دنیا میں پھیل گئے تھے اور اسلامی تصوف کا جو ضابطہ وجود میں آیا وہ ابدی علوم کا حصہ بن گیا تھا۔ اس دَور کے فرقہ معتزلہ کے ایک نمایاں شخص ابوالقاسم الکلبی کا کہنا ہے کہ:
"میں نے بغداد میں ایک مرشد کو دیکھا جو جنیدؒ کے نام سے پکارے جاتے تھے میری آنکھوں نے اس جیسا آج تک نہیں دیکھا۔ اہلِ قلم اُن کی محفل میں اسلوبِ نگارش سیکھنے آتے تھے۔ فلاسفر اُن کے پاس اُن کے گہرے خیالات سے استفادہ کرنے آتے تھے۔ شاعروں کو اُن سے تشبیہات ملتی تھیں، دینیات کے عالم اُن کے درس کے مضامین سے کسب فیض کرتے۔ وہاں کی گفتگو شعور و ادراک سے علمیت اور بلاغت کے تمام معیارات سے بلند ہوتی تھی۔"

محققین لکھتے ہیں کہ بغداد کے مدرسۂ تصوف پر عتاب کے بعد حضرت جنیدؒ کی روح مرجھا سی گئی اور اُن کی آئندہ زندگی پر ایک سایہ کی سی کیفیت پیدا کر دی۔ ان کے لئے یہ ایک ناخوشگوار تجربہ تھا جس نے انہیں لوگوں سے بالکل ہی الگ تھلگ کر دیا۔ اُن کے عزیز ترین دوست اور شاگرد یا تو خالقِ حقیقی سے جا ملے تھے یا دور دراز کے ملکوں میں چلے گئے تھے اور اپنے صوفیانہ فرائض ادا کر رہے تھے۔ انہوں نے اپنا دل عبادت میں زیادہ ہی لگا لیا۔ سرکاری حکام کے شکوک و شبہات سے بچنے کے لئے انہوں نے کھلے بندوں حلقۂ ارشاد میں درس دینا بند کر دیا، اسی دوران اُن کے شاگرد ابوبکر شبلیؒ نے انہیں ایک بہت ہی جرأت مندانہ خط تصوف کے رنگ میں لکھا۔ حضرت جنیدؒ نے اسے پسند نہ کیا اور ان الفاظ کے ساتھ یہ خط واپس کر دیا کہ

"اے ابوبکر! لوگوں کے معاملے میں احتیاط سے کام لو۔ ہم اہلِ تصوف جب بھی گفتگو کرتے ہیں تو اپنے الفاظ پر ظاہری پردہ ڈال لیتے ہیں اور پھر ان الفاظ کو یک رو سے الگ کر کے اُن پر تبادلۂ خیال کرتے ہیں۔ لیکن تم ہو کہ تصوف پر گفتگو کرتے وقت سب پردے چاک کر دیتے ہو۔"

اُن دنوں حضرت جنیدؒ دور دراز کے دوستوں اور شاگردوں سے خط و کتابت میں بہت محتاط ہو گئے تھے اور ان کا سارا زور اس بات پر ہوتا تھا کہ تصوف کی تعلیمات اسلامی مذہبیت ہی کی بنیادوں پر قائم ہونا چاہئیں۔ وہ پیہم خدا پرستانہ زندگی بسر کرتے۔ روزانہ بہت ساری رکعتیں نماز پڑھتے۔ قرآنِ پاک کی تلاوت اُن کے روزمرہ معمولات پر سب سے زیادہ حاوی تھی اور عبادت نے انہیں بہت کمزور کر دیا تھا۔ محبت کرنے والوں نے درخواست کی کہ "اے مرشد! آپ بوڑھے اور کمزور ہو گئے ہیں ان میں سے کچھ نوافل چھوڑ دیجئے۔" یہ سُن کر حضرت جنیدؒ نے کہا "یہی تو وہ چیزیں ہیں جن کے ذریعے میں اس مرتبے کو پہنچا ہوں اور اب یہ ناممکن ہے کہ میں ان سے دستبردار ہو جاؤں۔"

دارا شکوہ نے اپنی تصنیف "سفینۃ الاولیا" میں لکھا ہے کہ حضرت جنیدؒ رات بھر ایک پاؤں پر کھڑے ہو کر اللہ کا ذکر و فکر کرتے تھے یہاں تک کہ صبح کی نماز کا وقت آجاتا اور عشاء کی نماز کا جو وضو کیا ہوتا اسی سے صبح کی نماز ادا کرتے۔

شیخ ابو جعفر حدادؒ نے ایک دفعہ کہا: "اللہ تعالیٰ نے تیس سال تک حضرت جنیدؒ سے جنیدؒ کی زبان میں گفتگو کی اور کسی کو اس کا علم تک بھی نہ ہوا اور اگر عقل مرد ہوتی تو اس کی شکل و صورت بالکل جنیدؒ جیسی ہوتی۔" شیخ ابو جعفر حدادؒ نے یہ بھی کہا کہ ایک دن میرا دل میرے پہلو سے غائب ہو گیا۔ میں نے خدا سے عرض کیا بارالٰہ میرا دل لوٹا دے۔ جواب ملا ہم اپنے جنیدؒ کے پاس تیرا دل لے گئے تھے تاکہ تو ہماری معیت میں رہے تو پھر یہ کیوں مطالبہ کرتا ہے کہ تیرا دل ہمارے غیر سے رشتہ جوڑے (اللہ تعالیٰ نے جنیدؒ کی یاد کو اپنی یاد قرار دیا ہے) یہ روایت بھی بیان کی جاتی ہے کہ ایک شخص نے رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کی خواب میں زیارت کی اور دیکھا کہ آپؐ کی محفل میں حضرت جنیدؒ بھی تشریف فرما ہیں۔ کسی شخص نے حاضر ہو کر رسول اللہؐ سے فتویٰ طلب کیا۔ آنحضرتؐ نے فرمایا

"فتویٰ جنیدؒ سے لو۔"

اس شخص نے دوبارہ عرض کیا۔ یا رسول اللہؐ! آپؐ کی موجودگی میں دوسرے سے فتویٰ کیوں لوں۔" ارشاد ہوا "تمام انبیاؑ کو جس طرح اپنی اپنی اُمت پر ناز ہے اسی طرح مجھے جنیدؒ پر

فخر ہے۔"

حضرت جنیدؒ کے تذکرہ نویسوں نے لکھا ہے کہ اُن سے کبھی ظاہر و باطن میں کوئی ایسا فعل سرزد نہ ہوا جو شریعت کے منافی ہو۔ سماع اور وجد کی محفلوں سے ہمیشہ گریز کرتے۔ ایک دن وعظ کر رہے تھے کہ جوشِ اضطراب میں ایک نوجوان نے زور سے نعرہ بلند کیا۔ حضرت جنیدؒ نے اسے فوراً روک دیا اور کہا۔ اگر دوبارہ آہ و بکا کی تو تمہارا ہم سے کوئی تعلق نہ ہوگا۔ اس نوجوان نے آئندہ کے لئے توبہ کی لیکن جذبات پر قابو رکھنے کی کوشش میں اندر ہی اندر جل گیا اور انتقال کر گیا۔ اسی طرح ایک روز اپنے حلقۂ ارشاد سے خطاب کر رہے تھے کہ کسی شاگرد نے سوال کیا

"انسان کا دل کس وقت مطمئن و مسرور ہوتا ہے؟"

حضرت جنیدؒ نے جواب دیا "جب دل جلوہ گاہِ خداوندی بن جائے۔"

حضرت جنیدؒ ایک رات نماز ادا کر رہے تھے لیکن نفس نے ایک بھی سجدہ کی اجازت نہ دی۔ اسی پریشانی میں باہر آ گئے دیکھا کہ دروازے پر ایک نوجوان کمبل میں لپٹا ہوا پڑا تھا اور کہنے لگا۔

"میں اتنی مدت سے آپ کے انتظار میں ہوں۔"

حضرت جنیدؒ نے کہا معلوم ہوتا ہے کہ وہ تو ہی ہے جس نے میرا سکون برباد کیا ہے۔" اس نے کہا بلاشبہ میں وہی ہوں اور مجھے بتائیے کہ جس نفس میں درد ہو اور اس کے علاج کی کوئی صورت نہ ہو تو وہ کیا کرے؟"

حضرت جنیدؒ نے جواب دیا "جب تو نفس کی خواہش کے خلاف چلے گا تو اس کا درد علاج اور اس کی تکلیف آرام میں بدل جائے گی۔"

حضرت جنیدؒ کا جواب سن کر اس نے اپنا سر گریبان میں ڈالا اور کہنے لگا "اے نفس! تو نے یہی جواب مجھ سے سنا تھا اور یہی جواب حضرت جنیدؒ کا ہے۔" یہ کہہ کر وہ ایک طرف چل دیا۔

حضرت جنیدؒ کا جب وقتِ وصال آیا تو آپ کی زبان پر تسبیح جاری تھی۔ چاروں انگلیاں بند ہو چکی تھیں اور انگشتِ شہادت کھلی تھی۔ بسم اللہ پڑھی، آنکھیں بند کیں اور اپنے خالق سے جا ملے۔ غسل دینے کا وقت آیا اور آنکھوں میں پانی ڈالنے کی کوشش کی گئی تو آواز آئی "ہمارے دوست کی آنکھوں سے ہاتھ پرے کر لو، جو آنکھ ہمارا نام لے کر بند ہو، وہ ہمارے لئے کھل سکتی ہے۔" اس کے بعد آپ کی انگلیاں کھولنے کی کوشش کی گئی۔ اس پر بھی آواز آئی "جو انگلیاں ہمارا نام لے کر بند ہوں وہ ہمارے حکم سے ہی کھل سکتی ہیں۔" جب آپ کا جنازہ اٹھا تو ایک کبوتر اڑتا ہوا آیا اور جنازے پر بیٹھ گیا۔ کبوتر کو اڑانے کی بہت کوشش کی گئی لیکن ناکام ہو گئی اس پر کبوتر نے کہا "اپنے آپ کو اور مجھے پریشانی میں مبتلا نہ کرو۔ میرے پنجے اس جنازہ کے گوشوں میں عشق کی میخوں سے جڑے اور گڑے ہوئے ہیں۔ آج جنیدؒ کا قالب فرشتوں کے کندھوں پر ہے۔"

حضرت جنیدؒ نے بروز بدھ، ۲۷ رجب ۲۹۷ھ میں وفات پائی اور ان کا مزار اقدس بغداد میں ہے۔

حضرت جنیدؒ کی تعلیمات اور نظریات

کہتے ہیں کہ جب حضرت جنیدؒ دنیا سے رخصت ہونے لگے تو انہوں نے وصیت کی کہ میری کتابیں میرے ساتھ ہی دفن کر دی جائیں۔ اس سے یہ سمجھنا مشکل نہیں کہ حضرت جنیدؒ نے کتابیں بھی تصنیف کیں۔ صوفیانہ لٹریچر میں اُن کی کتابوں کا تذکرہ اس امر کا ثبوت بھی فراہم کرتا ہے۔ تاہم اُن کی تعلیمات و نظریات جو آج کے دور تک اہلِ دانش تک پہنچے ہیں ان کا ذریعہ یا تو اُن کے شاگردوں اور معاصرین کی تحریریں ہیں یا وہ رسائل ہیں جنہیں رسائلِ جنیدؒ کہا جاتا ہے۔ ان رسائل کی روشنی میں یورپ اور مشرق میں اب تک نمایاں تحقیقی کام ہوا ہے۔ اس کے علاوہ حضرت جنیدؒ کے اقوال و افکار صوفیہ کے اب تک کے سلسلوں میں سینہ بہ سینہ محفوظ ہیں اور ہر صوفیانہ مسئلے اور معاملے میں اُن کی رائے سے ہی رہنمائی اور بصیرت حاصل کی جاتی ہے۔

حضرت جنیدؒ کے الہامی فکروں پر مبنی اقوال و افکار کی روشنی میں مغرب اور مشرق کے صوفی دانشوروں نے جو تحقیقی مواد پیش کیا ہے اُن کے مطابق حضرت جنیدؒ کی گفتگو یا تحریر القاء و الہام کے تابع ہوتی تھی۔ اور ان کی تحریریں اگر عام لوگوں تک پہنچ جائیں تو اُن کے فہم میں بہت ساری غلطیاں ہو جاتیں اور شاید اسی لئے حضرت جنیدؒ نے کتابیں اپنے ساتھ ہی دفن کرنے کی وصیت کی تھی کیونکہ ان کی تحریریں اپنے اندر الگ خصوصیت رکھتی تھیں اور ان میں غیر شعوری بصیرت کی جھلک دکھائی دیتی تھی۔ جو کچھ انہوں نے اپنے رسائل یا خطوط میں بیان کیا ہے وہ خود اس کے تجربے سے گزرے ہوئے تھے اور وہ اسے نظریئے کے طور پر بیان نہیں کرتے بلکہ تجربے کی شکل میں دوسروں تک منتقل کرتے ہیں۔ ان کا اندازِ تحریر منظم ہے۔ جس خیال کو بھی انہوں نے قلمبند کیا ہے اس کے اندر مکمل نظم و ضبط، طرزِ اظہار کی پختگی اور مہارت ملتی ہے اور ان کے بعد اس معاملے میں بمشکل ہی کوئی ایسا شخص نظر آتا ہے جو ان کے مرتبے کا ہو۔ چنانچہ محققین کی یہ رائے ہے کہ ان کی تحریروں میں منطق و استدلال کا استعمال برمحل اور انتہائی خوب صورت ہے۔ اور وہ دل میں اتر جانے والے انداز سے کلام کرتے ہیں اس کے ساتھ ساتھ وہ ایسے مقام پر آ جاتے ہیں جہاں منطق و استدلال بھی پیچھے رہ جاتے ہیں اور عقل انسانی کے لئے آگے بڑھنا ناممکن ہو جاتا ہے لیکن حضرت جنیدؒ اس مقام پر اپنی وجدانی بصیرت سے کلام کرتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں اور اپنے نظریئے کو سننے اور پڑھنے والے کے فہم کا حصہ بنا دیتے ہیں تاہم ان کا طرزِ تکلم اور اندازِ بیان پُراسرار ضرور ہے اور وہ کسی اہم بات کا ذکر کرتے کرتے صرف ایک اشارہ کر کے آگے بڑھ جاتے ہیں کیونکہ اس دور میں جب حضرت جنیدؒ مسندِ ارشاد پر متمکن تھے صوفیہ نے اظہارِ خیال کا اشارتی انداز اختیار کیا ہوا تھا اور حضرت جنیدؒ کا ارشاد ہے کہ حقیقتِ الٰہی سے ناواقف لوگوں کے لئے صوفیانہ کلام میں بڑے خطرات ہیں۔ وہ کہا کرتے تھے کہ انسان (صوفی) ان عوام سے جو بھی بات کرے ان کا خیر خواہ اور محتاط ہو کر کرے اُن کے ساتھ اسی معاملے میں گفتگو کرے جو ان کے دائرۂ فہم میں ہو۔ اس سلسلے میں ان کے اشاراتی اور پُراسرار اندازِ تکلم کا ثبوت اُن کے خطوط سے بھی ملتا ہے جو انہوں نے صوفیانہ معاملات پر صوفی دوستوں کو تحریر کئے۔ مثال کے طور پر وہ ایک خط کے جواب میں لکھتے ہیں۔

"اور یہ اشارات جو میں نے اس موضوع پر کئے ہیں ان کی وضاحت کی حدود اتنی طویل و عریض ہیں کہ اگر اس موضوع کی حقیقت بیان کی جائے تو خط کا دامن بہت تنگ ہے۔ اے میرے بھائی خدا تم سے راضی ہو۔ تمہارا خط ملا جس کا ظاہر و باطن اور اوّل و آخر میرے لئے باعثِ مسرت ہے اور اس کے اندر تم نے جو غیر معمولی علم، نایاب حکمت، واضح و روشن اشارات کی باتیں کی ہیں ان کو پڑھ کر میں بے حد خوش ہوا ہوں۔ اس خط میں تم نے جو باتیں کھول کر بیان کی ہیں وہ بھی اور جو اشارات کی زبان میں کہی جا سکتی ہیں وہ بھی میں نے سمجھ لی ہیں چونکہ تمہاری ان باتوں سے آشنا ہوں اور تمہارا مقصود و مطلب پہلے ہی جانتا ہوں یہ سب کچھ جو تم نے لکھا ہے میرے لئے واضح و بیّن ہے۔ تم نے کبھی غور کیا کہ انسان کی اس فکر کا کہاں ٹھکانا ہے اور اس کا مصدر و منبع اور اس کی غرض و غایت کیا ہے، اس کا اوّل و آخر کیسے متعین ہوا اور اس فکر و خیال کے بارے میں جس کسی پر بھی فیصلہ صادر ہوا تو وہ کیوں کر صادر ہوا!"

حضرت جنیدؒ خطوط اور رسائل کے شروع میں اللہ تعالیٰ کی حمد اور رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم پر درود و سلام لکھتے تھے اور پھر بغیر تمہید کے اپنے موضوع کے بارے میں براہِ راست اظہارِ رائے کرتے تھے۔ اس سے متعلقہ ہر مسئلے کی تشریح کرتے جاتے اور پھر ساری بحث کو سمیٹ کر ایک والہانہ انداز میں اپنے موضوع کو عقیدہ توحید کے ساتھ ملا دیتے۔ ان کے ایک خط کا اقتباس ہے۔ "اور وہ یعنی انسان اس حالتِ قرب کو برداشت کرے تو کیسے کرے۔ ورنہ واردات کا اس کی عقل کہاں تک احاطہ کرے جو اس حالت میں انسان پر وارد ہے اور ایسا اسی صورت میں ہو سکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کا نگہبان ہو اور اس کے باطنی اسرار کی حفاظت کر رہا ہو ذرا سوچو تو تم اس وقت کہاں ہو اور کس حال میں ہوتے ہو جب کہ وہ پوری طرح تمہیں اپنے حضور میں سمیٹ لیتا ہے اور جو کچھ بھی تمہاری ذات سے چاہتا ہے اپنے سامنے حاضر کر لیتا ہے پھر وہ تمہیں اس کی شناخت بھی بخشتا ہے کہ جو کچھ وہ کہے تم سنو اور جو کچھ سنو اس کا جواب بھی دو۔ اس وقت تمہاری یہ حالت ہوتی ہے کہ تم بیک وقت مخاطب بھی ہوتے ہو اور متکلم بھی۔ تم سے اپنی کیفیات کے بارے میں پوچھا بھی جاتا ہے اور تم خود بھی پوچھنے والے ہوتے ہو اور اس وقت تم پر اس غالب ہستی کی طرف سے حقائق کے نایاب موتی اور شواہد کے نور برسنے لگتے ہیں لہذا اس کی نعمت گر تمہارے شاملِ حال نہ ہو اور وہ تمہارے دل کو سکون و طمانیت کے ساتھ نہ تھام لے تو اس واردات سے حیران و مبہوت عقلیں اس مقام کی حدت سے تہس نہس ہو کر رہ جائیں۔ اور یہ وہ مقام ہے جہاں بڑے بڑے عارفوں کی تمیز گم ہو جاتی ہے اور یہی مقام ذروۂ منزل اور چوٹی ہے اس چیز کی جو اوپر بیان ہوئی ہے۔"

یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ تصوف جو سراسر ایک باطنی عمل ہے اس کے اظہار کے لیے سب سے پہلے حضرت جنیدؒ نے ایک خاص اصطلاحی زبان اور مخصوص لب و لہجہ تخلیق کیا جو ان کے خطوط اور تحریروں کے ذریعے فروغ پذیر ہوا۔ اور پھر رفتہ رفتہ اس میں استحکام پیدا ہو گیا۔ تصوف کی اصطلاحی زبان اور مخصوص لب و لہجے سے آنے والی نسلوں کو الٰہیات، فلسفہ اور دوسرے علوم پر غور و فکر کرنے کے لیے زبردست مدد ملی اور اس کے ساتھ ساتھ صوفیانہ اصطلاحوں میں عہد بہ عہد ترقی ہوتی گئی اور ایک پختہ اسلوب وجود میں آ گیا لیکن اس کے آغاز کنندہ حضرت جنیدؒ ہیں اور ان کی تحریروں میں حرارت ہے جذبہ و احساس کی پوری قوت، علم و فضل کا شکوہ اور روح کی گہرائیوں کے ولولے شامل ہیں۔

حضرت جنیدؒ کی تعلیمات اور نظریات کا پھیلاؤ ان صوفیانہ امور پر ہے جن میں حقیقت کا جوہر، انسان کے ذاتِ باری سے تعلق کی نوعیت اور روح کی حقیقت شامل ہیں۔ محققینِ تصوف لکھتے ہیں کہ تصوف جو ابتدا میں زہد و فقر کا نام تھا اور جب رازدارانہ رویے میں تو اس کے اظہار کی راہیں کھولتے ہیں جہاں معروف کرخیؒ اور سری سقطیؒ جیسے جلیل القدر صوفیہ نظر آتے ہیں وہاں ان راہوں کو غور و فکر کی رو سے روشن کرنے میں حضرت جنیدؒ کا کردار منفرد حیثیت رکھتا ہے کیونکہ انہوں نے اپنے الہامی فکر سے تصوف کے سربستہ رازوں کے اظہار کا موثر طریقہ عطا کیا اور پہلی مرتبہ تصوف ایک سائنٹفک نظریے کے طور پر علمی اور تحقیقی دنیا میں تسلیم کیا جانے لگا۔ اور اس سے بڑھ کر یہ کہ تصوف جب کہ اسلام کی مروجہ تعلیمات سے رشتہ کمزور ہونے لگا تھا پھر سے مضبوط اور توانا ہو گیا۔

حضرت جنیدؒ پہلے نظریاتی صوفی معلم ہیں جنہوں نے صوفیہ کے الگ الگ گروہوں کے نظریات کی تنقیح کی اور انہیں ان کے حقیقی مرکز سے وابستہ کر دیا۔

حضرت جنیدؒ جن کی تعلیمات کی بنیاد توحید کا وہ تصورِ حقیقی ہے جس کا سرچشمہ قرآن پاک اور احادیث نبویؐ ہیں اور انہوں نے ثابت کیا ہے کہ اللہ تعالیٰ ہی ایک ایسا وجود ہے جس سے لو لگائی جا سکتی ہے اسی کے بارے میں غور و فکر کیا جائے اور انسان اس کی بااختیار قوت کے سامنے صرف ایک بندہ ہے۔ خدا ہی واحد حقیقت ہے اور یہ دنیا مظاہر کی وجودِ حقیقی کا ایک سایہ اور عکس ہے۔ چنانچہ جب انسان بصورت مشیتِ الٰہی تھا تو وہ کیونکر مرکز سے جدا ہوا۔ اس کی جدائی کی نوعیت کیا ہے اور اس جدائی کے دریا کو کیسے عبور کیا جا سکتا ہے۔ پھر جدائی کے خاتمے کے بعد جب انسان دوبارہ اپنے حقیقی مرکز یعنی وجودِ حقیقی سے رسائی حاصل کرنے میں کامیاب ہوتا ہے تو اس رسائی کی نوعیت اور کیفیت کیا ہے؟

حضرت جنیدؒ کے فکر و عمل میں ان تمام اہم اور سربستہ سوالوں کے جواب ایک واضح اور دلنشیں اسلوب میں ملتے ہیں اور ان کی تحریروں سے مقامِ الوہیت کا لازوال اور غالب شعور ملتا ہے اس کے علاوہ ذاتِ باری کی جانب سفر کے مراحل کی نشاندہی ملتی ہے اور صوفیانہ عمل کا وہ مرحلہ جہاں بھٹک جانے کا اندیشہ لاحق ہوتا ہے وہاں حضرت جنیدؒ مکمل احتیاط کے ساتھ آزمائش کے اس کٹھن مرحلے سے بچا کر ایک ایسی بصیرت عطا کرتے ہیں جو قدم قدم پر ہر سچے خدا پرست کی رہنمائی کرتی ہے بلکہ اسے پوری حفاظت کے ساتھ قربِ الٰہی کی ابدی حالت میں داخل کرتی ہے۔

حضرت جنیدؒ کی تحریروں میں اگرچہ مخصوص اصطلاحی زبان سے تعارف ہوتا ہے لیکن ان میں اعلیٰ درجے کی فنکارانہ خوبیاں ہیں اور ابلاغ کے حسنِ کمال سے مزین ہیں اور اسلامی صوفیانہ لٹریچر میں انہیں کلاسیک کا سا درجہ حاصل ہے۔ ان میں خیال اور اظہار کا گہرا لیکن تر و تازہ لہجہ ہے جس کا سارا آہنگ الہامی ہے۔ خیال اور نظریہ کی صداقت کے تقدس کا احساس پڑھنے والے کو اپنی طرف کھینچ لیتا ہے اور وہ ایک کھرے، بے ریا، واضح اسلوب کے ساتھ براہِ راست قلب و نظر سے کلام کرتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں ان کا اندازِ تخاطب اس طرح کا ہے کہ وہ خود ہی کسی مسئلہ پر سوال کرتے ہیں اور خود ہی جواب دیتے ہیں اور مسائل پر گفتگو کے دوران ایک فقیہانہ بصیرت کے ساتھ فکری انتشار کو ختم کر کے ایک واضح مقام پر لے آتے ہیں۔ صوفیانہ علوم میں ان کی موجود اور شائع شدہ تصانیف کے موضوعات یہ ہیں۔ فنا۔ عہد و پیمان۔ مقامِ خداوندی۔ توحید۔ آدابِ فقر۔ روحوں کا علاج۔ صوفیہ کے مراتب۔ قرآنی تشبیہات اور مثالیں۔ اقرارِ وحدانیت کی صورت۔ دعا۔ صدیقین ابرار۔ مدہوشی۔ ہوش۔ ہمتوں کی بلندیاں۔ نفسی کیفیات کے راز۔ خدا کی ذات تک کا سفر اور وہ تمام مسائل جو مکمل صوفیانہ زندگی سے تعلق رکھتے ہیں۔ اس کے علاوہ چند خطوط بھی محفوظ ہیں جو حضرت جنیدؒ کے منفرد اسلوبِ نگارش کا روشن ثبوت ہونے کے ساتھ ساتھ ان کی وسیع علمیت، اظہار کی بے پایاں قوت اور تجربے کی ہمہ گیریت کا شعور بخشتے ہیں۔

شعبۂ دینیات الازہر یونیورسٹی قاہرہ کے صدر ڈاکٹر علی حسن القادر نے حضرت جنیدؒ کے نظریات پر جو تحقیقی مواد پیش کیا ہے ان میں حضرت جنیدؒ کے بعض مقالے ہیں اور خطوط کے متن بھی ہیں۔ جن کی مدد سے ہم یہ جانتے ہیں کہ حضرت جنیدؒ نے انسان اور خدا کے درمیان موجود فاصلے کو عبور کرنے کا ذریعہ تصوف ہی کو قرار دیا ہے اور ایک ایسا تصوف جو انسان کو معاشرتی و سماجی زندگی سے کاٹ کر الگ نہیں کرتا بلکہ انسانوں ہی میں رہ کر اسے اس قابل بناتا ہے کہ وہ معاشرتی و سماجی ذمہ داریوں کو اس سطح پر سرانجام دے کہ اس کا ہر فعل نیکی اور پاکبازی کا نمونہ ہو اور اس طرح وہ ہر لمحہ اپنے خالق سے وابستہ رہے، لیکن ان کی تعلیمات صرف خاص لوگوں کے لئے ہیں اور وہ خاص لوگ جو توحید کے مسافر ہیں اور توحید کے مسافر کے دینی جذبے کا نقطۂ آغاز اسی عظیم فاصلے کا احساس ہے جو انسان اور خدا کے درمیان پایا جاتا ہے اور یہی تصوف کی ابتدا ہے صوفی اس فاصلے اور دوری سے آگاہی سے ہی تصوف کی حدود میں داخل ہوتا ہے اور اس کی یہ خواہش لمحہ بہ لمحہ بڑھتی جاتی ہے کہ وہ اس فاصلے اور دوری کو ختم کر کے حقیقتِ کل سے وابستہ ہو جائے چنانچہ فاضل محقق نے لکھا ہے کہ اگر ہم حضرت جنیدؒ کی تعلیمات اور نظریات سے آگاہ ہونا چاہتے ہیں تو سب سے پہلے تصوف کے بارے میں ان کی آراء کی گہرائی میں اترنا ہی ہوگا اور اس کے بعد ہی اس کا سراغ مل سکے گا کہ ان کا انتہائی مقصد کیا ہے۔ تصوف کے بارے میں ان کے یہ چند

اقوال بہت معروف ہیں اور ان کی روشنی میں ان گنت صوفیانہ لٹریچر تخلیق ہوا ہے۔

۱ : تصوف یہ ہے کہ انسان اس طرح خدا کے ساتھ ہو کہ اس کا کسی بھی دوسری ہستی سے کوئی نسبت نہ ہو۔

۲ : تصوف ایک مسلسل عمل ہے جس میں انسان ہمیشہ رہتا ہے اور اصل و جوہر کے اعتبار سے یہ اللہ تعالیٰ ہی کی صفت ہے لیکن ظاہری حالت میں یہ انسانی صفت بن جاتی ہے۔

حضرت داتا صاحبؒ اپنی شہرہ آفاق کتاب کشف المحجوب میں تصوف کی اس تعریف کی وضاحت اس طرح کرتے ہیں کہ حقیقی توحید کی حالت میں کسی صورت انسانی صفات باقی نہیں رہتیں اس لئے کہ یہ ناپائیدار اور غیر مستقل صفات ہیں بلکہ محض عکس و سایہ ہیں جن کو ابدیت نہیں، اس لئے کہ علت خدا تعالیٰ ہے اور اس اصول کی بنا پر در حقیقت یہ خدا تعالیٰ ہی کی صفات ہیں۔

حضرت جنیدؒ صوفی کی تعریف اس طرح بیان کرتے ہیں کہ صوفی کامل لطافت کی حالت میں اپنی ذاتی صفات گم کر دیتا ہے اور اس گمشدگی صفات کے باعث وہ وجود خداوندی میں پوری طرح مدغم ہو جاتا ہے اور یوں وہ اپنے آپ سے بالکل گم ہو جاتا ہے۔ جب وہ اپنے آپ سے گم ہوتا ہے تو مکمل طور پر بارگاہِ خداوندی میں حاضر ہوتا ہے۔ دوسرے لفظوں میں وہ بیک وقت حاضر بھی ہوتا ہے اور غائب بھی۔ وہ اس جگہ ہوتا ہے جہاں وہ پہلے نہیں تھا اور اس جگہ موجود نہیں جہاں وہ پہلے موجود تھا۔ پھر جب اس کا وجود نہیں رہتا تو وہ وہاں موجود ہوتا ہے جہاں وہ ابتدائے آفرینش سے پہلے تھا۔ یوں وہ اپنے آپ میں آ جاتا ہے جبکہ وہ اس کے بعد اپنے آپ میں نہیں تھا۔ اس مقام پر وہ اپنے آپ میں بھی موجود ہوتا ہے اور ذاتِ خداوندی کے اندر بھی حالانکہ اس سے پہلے وہ صرف ذاتِ خداوندی میں موجود تھا اپنے آپ میں نہیں تھا وہ اس لئے کہ وہ غلبۂ خداوندی کی سرشاری سے نکل کر حالتِ ہوش کی کھلی فضا میں آ جاتا ہے جس کا مشاہدہ اسے واپس مل جاتا ہے تمام اشیاء اپنی پہلی حالت میں آ جاتی ہیں اور خود اس کو اپنی پہلی صفات واپس مل جاتی ہیں۔

حضرت جنیدؒ کی تحریر کے مندرجہ بالا اقتباس میں در حقیقت مکمل صوفیانہ پروگرام پوشیدہ ہے جس کی تحقیق کے نتائج میں صوفی محققین نے حضرت جنیدؒ کی صوفیانہ تعلیمات کو تین حصوں میں تقسیم کیا ہے اور بعض نے تو یہاں تک لکھا ہے کہ تصوف کی عمارت انہی تین ستونوں پر قائم ہے۔

۱ ۔ توحید۔

۲ ۔ فنائے صفت۔

۳ ۔ بحالیٔ ہوش۔

اسلامی تصوف در حقیقت عقیدہ توحید الٰہی کی سالمیت کا نام ہے اور اس کی صحت کا معیار قرآن و سنت ہیں۔ اور حضرت جنیدؒ نے اسے زمانے کے مزاج سے ہم آہنگ ہو کر حل کیا ہے حضرت جنیدؒ کے نزدیک توحید عقلی ادراک سے کوئی ماورائے شے ہے اور حضرت جنیدؒ کے اسی فکر کی لڑی میں صوفیہ نے کہا کہ اللہ تعالیٰ کی توحید بیان نہیں کی جا سکتی۔ حضرت جنیدؒ نے اس مسئلے پر اظہارِ خیال کرتے ہوئے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی توحید کے بارے میں اس تعریف کو بیان کیا ہے کہ "تعریف ہو رب ذوالجلال کی جس نے اپنے بندوں کو اپنا علم حاصل کرنے کا کوئی دوسرا ذریعہ عنایت نہیں فرمایا سوائے عجز و بے بسی کے جو انہیں اس کا علم حاصل کرنے میں پیش آتی ہے۔" اور حضرت جنیدؒ جب توحید کے بارے میں کلام کرتے ہیں تو ان کے اقوال کا اول و آخر مفہوم یہی سمجھ میں آتا ہے کہ توحید عقلی ادراک سے ماورا شے ہے اور ان کے یہ اقوال کہ "توحید ایک ایسی حقیقت ہے جس کی راہ کے نشان مٹ جاتے ہیں علامات مدغم ہو جاتی ہیں اور ذاتِ خداوندی جیسی تھی ویسی ہی رہتی ہے اور اگر فہم کا ادراک توحید پر جا کے ختم ہوتا ہے تو گویا یہ ایک حالت ثبات و قرار پر ختم ہوتا ہے۔ توحید جس میں اتنا مکمل اور ہمہ گیر علم شامل ہے کہ اس کی تعریف اور وضاحت ناممکن ہے۔"

حضرت جنیدؒ کے یہ اقوال توحید کے صوفیانہ فکر کی نمائندگی کرتے ہیں اور ان میں ایک عرفی کے لئے جو خاص معانی پوشیدہ ہیں حضرت جنیدؒ نے انہیں ان الفاظ میں بیان کیا ہے کہ توحید قدیم کو محدث سے جدا کرنے کا نام ہے۔ حضرت جنیدؒ کے ان معانی کو صوفی اساتذہ نے مکمل طور پر قبول کیا ہے لیکن اس کی تفسیر اپنے اپنے نقطۂ نظر سے کی ہے۔ لیکن وہ حضرت جنیدؒ کے اس قول کی فریم سے قدرا باہر نہیں ہوئے۔ حضرت داتا صاحبؒ نے حضرت جنیدؒ کے اسی قول کی رہنمائی میں فرمایا ہے کہ تم ایک ازلی کو مظہر حادث کی جگہ کبھی نہ سمجھنا اور ایک مظہر حادث کو ازلی کی جگہ، اس کے علاوہ یہ بھی جان لینا کہ اللہ تعالیٰ ازلی ہے اور تم مظہر ہو اور یہ کہ تمہاری نوع کی کسی چیز کا تعلق اس سے نہیں ہے اور نہ اس کی ذات کا کوئی صفات تمہاری اپنی صفات کے ساتھ ملی ہوئی ہیں اور یہ کہ ایک ازلی اور ایک مظہر کے درمیان نہ کبھی یکسانیت پیدا ہو سکتی ہے اور نہ اشتراک ہو سکتا ہے۔"

تمام علمائے دینیات اور صوفی مشاہیر نے حضرت جنیدؒ کی توحید کے بارے میں اس رائے کو مستند قرار دیا ہے اور اپنے فکر کو اسی کی روشنی میں آگے بڑھایا ہے اور علامہ قشیریؒ عقائد صوفیہ میں حضرت جنیدؒ کے اسی قول کو دہراتے ہیں کہ توحید ازل اور قدیم کو حادث سے جدا کرنے اپنے مانوس بسیروں کو ترک کرنے، جہالت بندوں کو چھوڑنے، معلوم و نامعلوم کو بھلا دینے اور ان سب کی جگہ ذاتِ خداوندی کو یاد رکھنے سے عبارت ہے۔" توحید کے بارے میں حضرت جنیدؒ کے اس قول کو تمام طبقوں کے علماء نے سراہا ہے اور کہا ہے کہ ازل اور حادث کے درمیان جو فرق ہے حضرت جنیدؒ نے اس کے متعلق جو کچھ کہا ہے وہ ایک ایسی چیز ہے جو صوفیہ کو تصورِ توحید کے سلسلے میں بھٹک جانے سے بچا سکتی ہے اور ذاتِ ازلی کو جدا کرنے، یعنی نہ صرف عقل کی بنیاد پر عمل میں لائی جانے والی جدائی تک ہی بلکہ ہر محدود چیز کو فنا کر کے لامحدود کے عملی تجربے کو ثابت کرتی ہے۔ حضرت جنیدؒ کا نظریۂ توحید در حقیقت تمام صوفیانہ علوم پر محیط ہے اور انہوں نے اس کو بڑی وضاحت سے بیان کیا ہے اور توحید پرستوں کو چار درجوں میں رکھا ہے۔ توحید میں پہلا درجہ عوام کی توحید ہے، دوسرے درجے میں وہ توحید آتی ہے جو دین کے روحانی علم سے بہرہ ور لوگوں میں پائی جاتی ہے۔ تیسرے اور چوتھے درجے کی توحید کا تجربہ ان خاص لوگوں کو ہوتا ہے جنہیں معرفت حاصل ہوتی ہے۔ ایک عام آدمی کی توحید حضرت جنیدؒ اس طرح بیان کرتے ہیں۔

"جہاں تک ایک عام آدمی کا تعلق ہے اس کا اظہار خدا کو وحدہٗ لاشریک قرار دینے، بہت سے خداؤں، ساتھیوں، حریفوں، ہمسروں اور تشبیہوں کو مسترد کر دینے میں ہوتا ہے لیکن اس کے ساتھ "غیر خدا طاقتوں سے امید و خوف بھی وابستہ ہوتا ہے اس طرح کی توحید اپنے اندر ایک افادیت ضرور رکھتی ہے کہ اس میں اقرار بہر صورت قائم رہتا ہے۔" دوسرے درجے کی توحید یہ ہے کہ ان لوگوں کی توحید جو علم ظاہر (دینی علم) سے بہرہ ور ہیں تو اس کا اظہار خدا تعالیٰ کی وحدانیت کے اقرار، نیز دوسرے خداؤں، شریکوں، حریفوں، ہمسروں اور مشابہتوں کے رد و ابطال سے ہوتا ہے۔ اس کے ساتھ جہاں تک ظاہری اعمال کا تعلق ہے ان میں ایجابی احکامات کی بجا آوری کی جاتی ہے۔ اور جن امور سے منع کیا گیا ہے ان سے اجتناب کیا جاتا ہے اور یہ سب کچھ نتیجہ ہوتا ہے اس طبقے کی امیدوں، خواہشوں اور اندیشوں کا۔ اس نوع کی توحید میں بھی ایک طرح افادیت مضمر ہے اس لئے کہ اس طرح اللہ تعالیٰ کی وحدت کا علی الاعلان ثبوت فراہم کیا جاتا ہے۔

حضرت جنیدؒ کے نزدیک توحید کے یہ دونوں درجے معرفت الٰہی کے بلند ترین درجے نہیں ہیں کیونکہ پہلے اور دوسرے درجے کا توحید پرست اپنے پاکیزہ جذبے اور معاشرے میں اپنے اچھے عمل سے اللہ تعالیٰ کی وحدانیت کا ثبوت تو مہیا کرتا ہے لیکن ہو سکتا ہے کہ نیکی اور عبادت ان

پر جو چیز اسے اکسانی ہے اس کی بڑیں ابھی تک امیدوں، اندیشوں اور خواہشوں میں، ہوتی ہوں۔ چنانچہ حضرت جنیدؒ توحید کے اس خاص درجے کو بیان کرتے ہیں کہ اس میں سب سے پہلے اللہ تعالیٰ کی وحدانیت کا اقرار کیا جائے۔ ہمسروں اور تشبیہوں کو نظر و مشاہدہ سے ساقط کر دیا جائے۔ خدا کے حکم کو ظاہر و باطن میں بیک وقت نافذ کیا جائے اور اللہ تعالیٰ کے ما سوا دوسری ہستیوں سے امید و خوف کے جذبات کو مکمل طور پر ختم کر دیا جائے اور یہ سب کچھ نتیجہ ہو انسان کے اس شعور کا کہ اللہ تعالیٰ کی ذات ہر جگہ، ہر آن اس کے ساتھ موجود ہے۔ اس کے علاوہ یہ کہ اللہ تعالیٰ اسے پکارتا ہے اور وہ اس کا جواب دیتا ہے۔

حضرت جنیدؒ جب اس خاص درجے کی توحید بیان کرتے ہیں تو اس سے اُن کا مطلب یہ ہے کہ توحید کی اس حالت میں بھی خدا پرست کی انفرادیت تام ہوتی ہے اس لئے کہ وہ ابھی تک اللہ تعالیٰ کی ذات کے ساتھ ساتھ اپنی ذات کے وجود کا بھی احساس رکھتا ہے اور جہاں اپنی ذات کے وجود کا احساس ہو وہاں توحید اپنے خاص مقام کے درجے کی حامل نہیں ہوتی اور خاص مقام کی توحید کی حالت کو حضرت جنیدؒ نے ان الفاظ میں بیان کیا ہے کہ۔

"توحید کی خاص حالت کی نوعیت یہ ہے کہ انسان اپنے وجود کے احساس سے بھی یکسر عاری ہو اور ایک خیالی وجود کی صورت میں اللہ کے سامنے حاضر ہو۔ ان دونوں کے درمیان کوئی تیسری چیز موجود نہ ہو۔ پھر جس جس طرح اس ذاتِ مطلق کی قدرت کا ملہ طے کرتی ہے اسی کے مطابق اس خیالی وجود پر مختلف صورتوں میں اثر انداز ہوتی ہے۔ اسے توحید ذاتِ حق کے بحرِ بیکراں میں پوری طرح غرق کر دیا جاتا ہے یہاں تک کہ یہ خیالی وجود اپنی ذات میں بالکل فنا ہو جاتا ہے پھر نہ حق تعالیٰ کی ندا کا سوال باقی رہتا ہے اور نہ اس کی طرف سے اس ندا کے جواب کا۔ اس مقام پر اللہ تعالیٰ کی وحدانیت کا کامل ادراک اس کے قرب کی وجہ سے حاصل ہوتا ہے اس حالت میں انسان کے اندر حس اور حرکت ختم ہو جاتی ہے اس لئے کہ جو چیز اللہ تعالیٰ نے اس سے طلب کی تھی وہ اس کے لئے خود ہی مہیا کر دی تھی۔"

صوفی مشاہیر نے حضرت جنیدؒ کے اس تصورِ توحید خاص کی اس طرح تشریح کی ہے کہ اس مقام پر آنے کا مقصد اللہ تعالیٰ کی رضا کے تحت ہو جاتا ہے اور اپنے ارادہ و خواہش سے دستبردار ہو جاتا ہے۔ حضرت جنیدؒ نے اس تصورِ توحید کی حضرت داتا صاحبؒ نے ان الفاظ میں وضاحت کی ہے کہ ایک خدا پرست کو جب اپنی ذات کا کوئی احساس نہیں ہوتا تو وہ ایک ایسا ذرہ بن جاتا ہے جیساکہ وہ ماضیٔ ازل میں تھا جب اس سے توحید کا اقرار کرایا گیا اور اس کے یہ معنی بھی ہیں کہ جب ایک فرد پر ذاتِ حق کے اظہار کا غلبہ ہوتا ہے تو وہ ملیا میٹ ہو جاتا ہے یہاں تک کہ وہ احساس سے عاری ایک لطیف مادہ بن جاتا ہے اس کا جسم اللہ تعالیٰ کے اسرار کا خزانہ بن جاتا ہے اور اس کے تمام اقوال و افعال کا سرچشمہ وہی ذاتِ باری قرار پاتی ہے۔"

حضرت جنیدؒ نے توحید کے اس خاص اور آخری درجے کے سلسلے میں اظہارِ خیال کرتے ہوئے نظریۂ اتحاد یعنی خالقِ عظیم اور انسان (مخلوق) کے درمیان تعلق کی آگہی اور نظریہ فنائے صفت یعنی ذات سے عاری ہو کر اللہ تعالیٰ کی ذات کے اندر محصور ہونا تخلیق کیا ہے اور دونوں کو ایک دوسرے کے متوازی رکھ کر وحدانیت کے اقرار کی تکمیل پر اختتام کیا ہے چنانچہ وہ توحید کے اس آخری اور خاص درجے کی شناخت کراتے ہوئے کہتے ہیں کہ اس خاص توحید کی حالت میں یہ نتیجہ برآمد ہوتا ہے کہ اس آخری درجے میں پہنچ کر ایک سالک اپنی اس پہلی حالت میں آجاتا ہے جہاں کہ وہ ابتدائے آفرینش سے پہلے تھا۔ حضرت جنیدؒ اس نظریئے کی تصدیق کے لئے قرآنِ پاک کی یہ آیت پیش کرتے ہیں کہ:

"اور جب تمہارے پروردگار نے بنی آدم سے یعنی اُن کی پیٹھوں سے اولاد نکالی اور انہیں خود ان کے اوپر گواہ بنایا (اور ان سے پوچھا) کیا میں تمہارا پروردگار نہیں ہوں۔ وہ کہنے لگے کیوں نہیں۔" (الاعراف ۱۷۲)

حضرت جنیدؒ فرماتے ہیں کہ اس آیت میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ اس نے بنی نوعِ انسان سے ایسی حالت میں خطاب فرمایا کہ وہ اس کائنات میں موجود نہیں تھے۔ صرف خدا کا وجود ان کے لئے موجود تھا۔ اس وقت وہ مخلوق انسانی کو ایسے معنی میں وجود دیا ہے تا کہ جس کی حقیقت اس کے سوا اور کوئی نہیں جانتا۔ اور نہ کوئی دوسرا اس راز کو پا سکتا ہے۔ اس نے کہ وہ ایک ایسا خالق تھا جو ہر طرف سے اُن پر احاطہ کئے ہوئے تھا۔ وہ انہیں تھے ایک ایسی حالتِ فنا میں دیکھ رہا تھا جو اُن کی حالتِ بقاء سے ابھی بہت دور تھی اور اُن نبی نوعِ انسان، کا زمان و مکان کی قید سے آزاد اور ازل کے ساتھ وابستہ تھا۔ چنانچہ جب اللہ تعالیٰ نے انہیں بلایا اور انہوں نے اس کی ندا پر فوراً لبیک کہا، تو یہ بھی اس کی ذات کا کرم اور احسان تھا اس نے اُن کو وجود میں لا کر گویا ان کی طرف سے خود ہی جواب دے دیا۔ اپنی ندا اور لکار کا مدعا انہیں سمجھایا اور اپنے وجود سے انہیں اس ذات سے آگاہ کیا جبکہ وہ محض ایک مشیتِ الٰہی تھے جو اس کی ذات نے ایک عارضی وجود کی شکل میں اپنے سامنے لا کھڑی کی تھی۔ پھر اس نے اپنے ارادے سے انہیں ایک دوسری حیثیت میں تبدیل کر دیا، انہیں نطفے کی طرح ایک چیز بنایا۔ اپنی مشیت سے اس کو حسن بخشا اور صلبِ آدم میں اتار دیا تو اللہ تعالیٰ مندرجہ بالا آیت (الاعراف ۱۷۲) میں بیان کرتا ہے کہ وہ ان سے ایسی حالت میں ہمکلام ہوا جب کہ ان کا اپنا کوئی وجود نہیں تھا سوائے اس ذاتِ حق کے وجود کے جو ہر طرف سے انہیں اپنے حصار میں لئے ہوئے تھا۔ وہ ایسی حالت تھی جس میں ان کا وجود اپنے آپ کے لئے نہیں تھا بلکہ اللہ تعالیٰ کے لئے اور اسی کے وجود میں محصور تھا اور اس طرح وجود کی دو قسمیں ثابت ہوتی ہیں، ایک وجود ربانی جو وقت کی قید سے آزاد وجودِ حق کے اندر محصور تھا اور دوسرا جو وقت کی قید میں عالم مخلوق کے اندر رہے۔"

حضرت جنیدؒ فرماتے ہیں کہ پس یہی وجود ربانی اور خدائی تصور ہے جو اللہ تعالیٰ کے سوا کسی دوسرے کو زیب نہیں دیتا۔ کوئی شک نہیں کہ ایسا وجود سب سے زیادہ مکمل اور کارگر ہوتا ہے۔ اور اسی عام وجود کے مقابلے میں ایک عام عبادت گذار دیکھا جاتا ہے۔ زیادہ اہمیت کا حامل زیادہ قوی اور غالب اور تسلط کے لئے زیادہ موزوں ہو جاتا ہے چنانچہ اس حالت میں اس کا اپنا نشان مٹ کے رہ جاتا ہے اور اس کا الگ کوئی وجود باقی نہیں رہتا۔ وہ اس لئے کہ کوئی انسانی صفت اور کوئی انسانی وجود اس چیز کے مقابلے میں نہیں ٹھہر سکتا یعنی وجودِ حق اور اسکا غلبہ و تسلط۔

پہلی قسم کا وجود، وجود کی ایک مکمل ترین قسم ہے یہ زیادہ بہتر زیادہ بلند مرتبہ اور خدا کے غلبۂ تسلط کے لئے زیادہ موزوں اور زیادہ لائق ہوتا ہے بسبب اُن صفات کے جو اس وجود کی ماہیت میں اُن میں ظاہر ہوتی ہیں۔"

حضرت جنیدؒ روحِ انسان کے بارے میں قرآنِ پاک کی شہادت پر بیان کرتے ہیں کہ عالمِ مخلوق میں آنے سے پہلے روح موجود تھی اور اسی اصول کی بناء پر وہ اس وجود کی صراحت کرتے ہیں جو اس دنیا میں آنے سے پہلے ایک حقیقی وجود تھا اور اس ثانوی وجود سے مختلف تھا۔ چنانچہ حضرت جنیدؒ توحید کی خاص حالت میں داخل ہونے کے لئے وجود ثانی کو ختم کرنا ضروری سمجھتے ہیں۔ تاکہ وہ اس اولین اور ابتدائی حالت میں واپس جا سکے جہاں وہ اپنی تخلیق سے پہلے تھا لہٰذا وہ پہلی جدائی جب وہ وجودِ حقیقی سے جدا ہوا تھا اپنی انفرادیت کے خاتمے اور ذات کے شعور سے عاری ہونے کے بعد ختم کر دیتا ہے اور فرماتے ہیں کہ اس طرح اللہ تعالیٰ اُن پر چھا جاتا ہے اور انہیں انسانی صفات سے عاری کر دیتا ہے۔ توحید کی اس خاص حالت کو آگے چل کر حضرت جنیدؒ یوں بیان کرتے ہیں کہ "اللہ تعالیٰ اپنے عبادت گذار کو وجود بخشتا ہے تو وہ اپنی مشیت کو ان پر جس طرح چاہتا ہے طاری کرتا ہے اس لئے کہ وہ ایسی صفات کا مالک

ہے جس میں اس کا کوئی شریک نہیں اور جب وہ خود اس پر غلبہ حاصل کرتا ہے تو اپنے آپ کو با جرأت غالب دنیا ہر اور مکمل طور پر فاتح ظاہر کرتا ہے اور کسی عبادت گذار کی اس حالت میں داخل ہونے کا مرحلہ اللہ تعالیٰ ہی کی تائید و حمایت سے ہے اور اللہ تعالیٰ ہی اس کی رہنمائی کرتا ہے اور جو کچھ چاہتا ہے اور جس طرح چاہتا ہے اس کا اسے مشاہدہ کرتا ہے اور اس صورت میں وہ اپنے بندے سے ہمیشہ صحیح کام اور ہمیشہ حق کی مدافعت ہی کراتا ہے۔ خدائے عز و جل کا یہ فعل اور اس کی بندے کے حق میں یہ عنایات اسی کی طرف منسوب ہوتی ہیں نہ کہ اس بندے کی طرف جو ان عنایات کو حاصل کرتا ہے اس لیے کہ تمام چیزوں کا منبع و مقصد اور وسیلہ و ذریعہ وہ بندہ کبھی نہیں ہو سکتا بلکہ یہ اس پر ایک بیرونی ذریعہ سے نازل ہوتی ہیں اور یہ ایک غیر انسانی ہستی کے ساتھ ہی منسوب ہونے کے لائق ہے اور یہ صحیح و جائز ہے کہ اللہ تعالیٰ کے یہ عطیے اور انعامات پوشیدہ ہی رہیں اور بندے کے ساتھ منسوب نہ ہوں۔"

حضرت جنیدؒ نے اس سلسلے میں وجود ربانی اور وجود ثانوی کی جن دو اصطلاحوں کے ذریعے صوفیانہ پروسس پر اظہار خیال کیا ہے محققین نے یہ نتائج اخذ کئے ہیں وہ حضرت جنیدؒ کے اس قول کی تصدیق کرتے ہیں کہ تصوف یہ ہے کہ خدا تمہیں اپنے اس ثانوی وجود سے فنا کر کے تمہیں اپنے آپ کے اندر ایک وجود بخشے اور ایک زندہ انسان وہ ہے جو اپنی زندگی کو اپنے خالق کے وجود کی بنیادوں پر قائم کرتا ہے نہ کہ وہ جو اپنی زندگی جسمانی پیکر کی حفاظت و بقا کی بنیاد پر استوار کرتا ہے لہٰذا اس کی زندگی کی حقیقت اس کی موت ہوگی اس لئے کہ وہ اس کے لئے اس اوّلین اور ابتدائی حالت وجود میں واپس لوٹنے کا ذریعہ ہوگی۔"

صوفیائے کرام نے اس سے یہ رہنمائی حاصل کی کہ انسان جو کہ خاکی پیکر سے پہلے اللہ تعالیٰ کے اندر ایک وجود رکھتا تھا جدا ہوا اور خاکی پیکر میں آنے کے بعد وہ اللہ تعالیٰ کی عنایت اور انعام سے دوبارہ اس جدائی کو عبور کر کے اللہ تعالیٰ کے اندر اسی وجود کو دوبارہ حاصل کر سکتا ہے اور اسلامی تصوف کی رو سے ایک صوفی جب اوّلین حالت میں واپس جانے کا ارادہ کرتا ہے تو یہ ارادہ بھی ارادۂ خداوندی ہوتا ہے اور اسے اپنی انفرادیت سے عاری ہونا پڑتا ہے۔ حضرت جنیدؒ جب انفرادیت اور اپنی ذات کے شعور سے عاری ہونے کے لئے فنائے صفت کے نظریہ کو پیش کرتے ہیں جو تصوف میں بہت ہی مشہور و معروف نظریہ ہے چنانچہ وہ بتاتے ہیں کہ اگر ایک خدا پرست وجود حقیقی کی حالت میں واپس جانا چاہتا ہے تو اسے اپنے انسانی وجود کو جو کہ ایک ثانوی وجود ہے ختم کرنا ہوگا تاکہ وہ وجود خداوندی میں جو کہ اصل اور مقدم چیز ہے ادغام ہو کر اپنے الٰہی وجود کا ادراک کر سکے۔

فنائے صفت

حضرت جنیدؒ نے اس پروسس کو فنائے صفت کا نام دیا ہے اور فرماتے ہیں کہ فنا کی تین قسمیں ہیں۔ پہلی فنا یہ ہے کہ تم اپنی صفات اخلاق اور مزاج کی قید سے آزاد ہو جاؤ اور اس حالت پر اپنے اعمال سے دلائل بہم پہنچاؤ۔ وہ یوں کہ تم سب محنت و ریاضت کرو، اپنے نفس کی خواہشات کے خلاف عمل کرو۔ جو کچھ تمہارا نفس چاہتا ہے اس کی بجائے تم اسے وہ چیز دو جس سے وہ نفرت کرتا ہے۔ دوسری قسم کی فنا یہ ہے کہ تم اپنے حظِ نفس سے بالکل دستبردار ہو جاؤ یہاں تک کہ اطاعت میں جو لذت ایک عبادت گزار کو ملتی ہے اس کے احساس سے بھی عاری ہو جاؤ۔ تم خود اسی کے اور صرف اسی کے ہو جاؤ۔ تمہارے اور ذاتِ حق کے درمیان کوئی واسطہ باقی نہ رہے۔ اور تیسری فنا یہ ہے کہ تجلیات ربانی کا تم پر اتنا غلبہ ہو جائے کہ تمہارے اس وجود موجود کی حقیقت تمہاری آنکھوں سے اوجھل ہو جائے۔ ایسی حالت میں تم ایک ایسا وجود فانی ہو جاؤ گے جو وجود ابدی کے ساتھ متحد ہو کر خود بھی ابدی ہو گیا ہوگا۔

تمہارا وجود وجودِ خداوندی کے سبب ہی ہوگا۔ اس لئے تمہاری فنا تو متحقق ہو چکی ہوگی۔ تمہاری رسم (ظاہری حیثیت) باقی رہے گی لیکن تمہارا نام اور تمہاری انفرادیت مٹ جائے گی۔

حضرت جنیدؒ نے فنا کے اس عمل کی تکمیل کو حالتِ الوہی کا نام دیا ہے اور ساتھ ہی وہ یہ بصیرت بھی عطا کرتے ہیں کہ انسان جب فنائے صفت کے پروسس سے گذر کر حالتِ الوہی میں داخل ہوتا ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ ذاتِ خداوندی جیسی ہے ویسی ہی رہتی ہے۔ کوئی چیز نہ تو اس میں داخل ہوتی ہے اور نہ اس میں سے کوئی چیز کسی دوسرے میں منتقل ہوتی ہے بلکہ یہ ایک ایسی حالت ہے جس میں فنا ہو کر داخل ہونے والا خدا کی ذات کے اندر بقا حاصل کرتا ہے کیونکہ انسان جو انسانیت کے جوہر سے متصف ہے اپنی انسانیت کے جوہر سے ہرگز محروم نہیں ہوتا اور ذاتِ باری کی خصوصیات بھی اسی طرح باقی رہتی ہیں۔ یہ حالت جو فنا کی آخری حالت ہے اس میں حالتِ بقا بھی شامل ہے اور انسان فنا ہو کر اللہ تعالیٰ کے اندر باقی رہ جاتا ہے یہ وہ حالت ہے جو اس وقت طاری ہوتی ہے جب ایک عبادت گذار پر ذاتِ الٰہی پوری طرح چھا جاتی ہے اسے اپنے حصار میں لے لیتی ہے اور اس کی انا، انفرادیت اور ذات کا شعور مٹ جاتا ہے اور وہ اپنی ابدی زندگی کی طرف واپس آ جاتا ہے۔ حضرت جنیدؒ اللہ تعالیٰ کے حصار میں آنے کے مرحلے کی ان الفاظ میں نشاندہی کرتے ہیں۔

"اس حالتِ الوہی میں بھی اور باوجود اس کے اللہ تعالیٰ کا وجود خالص اس پر چھایا ہوا ہوتا ہے اس کے لئے یہ ممکن نہیں ہوتا کہ وہ اس حقیقتِ پوشیدہ کا ادراک حاصل کر کے اپنے نفسِ مضطرب کو شفا بہم پہنچا سکے اس حالت میں صرف اتنا ہوتا ہے کہ وہ ذات اپنی صفاتِ علیا اور اسمائے حسنیٰ کے ساتھ دیکھی جا سکتی ہے۔"

حضرت جنیدؒ معرفتِ الٰہی کے اس مرحلے کے بارے میں پوری وضاحت کے ساتھ بیان کرتے ہیں کہ اس حالت میں جبکہ عبادت گذار فنائے صفت کے مرحلے سے گذر کر حالتِ الوہی میں داخل ہوتا ہے تو وہ کبھی بھی مکمل طور پر اللہ تعالیٰ کے ساتھ متحد نہیں ہوتا بلکہ وہ اس وجودِ حقیقی میں واپس آ جاتا ہے جس میں وہ اپنی جسمانی تخلیق سے قبل تھا اور حضرت جنیدؒ کی تعلیمات کا نچوڑ یہی ہے کہ فنائے صفت سے انسان کو قربِ الٰہی کا درجہ تو ضرور حاصل ہوتا ہے لیکن وہ اللہ تعالیٰ سے متحد نہیں ہوتا بلکہ اللہ تعالیٰ اس پر اس طرح چھایا ہوتا ہے جیسے انسان اس کے غلبے یا حصار میں آ گیا ہو۔ چنانچہ حضرت جنیدؒ فرماتے ہیں۔

جب انسانوں نے اس ذات کو اس کی اپنی رضا کے مطابق طلب کیا اور اپنے آپ میں اسے جذب کرنے میں ناکام رہے تو ان لوگوں نے گویا خود اس کی خواہش کی کہ اللہ تعالیٰ کی ذات ان کے نفوس پر چھا جائے اس طرح انہوں نے اپنی ذات کے لئے ایک آزمائش حاصل کی۔ اس لئے کہ ان کے اندر اشیاء کی لذت ابھی باقی ہوتی ہے اور اس وجہ سے ان کے آگے ایک پردہ سا آ جاتا ہے جس کے نتیجے میں جب بھی کوئی فخر کا موقع ہو یا ذکر و فکر کا کوئی نتیجہ برآمد ہو یا اپنے نفس کی کسی خواہش پر غلبہ و قدرت حاصل ہو تو وہ اپنی انا اور خودی کے تقاضوں کے تحت اشیاء پر حکم لگانے میں اپنے احساسات کو کام میں لاتے ہیں اور اپنے آپ کو دیکھ کر خوش ہوتے ہیں۔ اس کا علم تو صرف انہی لوگوں کو ہوتا ہے جو خود اس کیفیت سے گذرتے ہیں اس کے سوا نہ کوئی اسے دیکھ سکتا ہے نہ اس کی تاب لا سکتا ہے اور کوئی نہیں جان سکتا کہ انہوں نے کیونکر ذاتِ الٰہی کی طلب کی اور پھر بھی اس تک نہ پہنچ سکے۔ اس مقصد کے لئے انہوں نے ہر وسیلے کو پکڑا اور ساکن حقیقتوں کی بھی مدد حاصل کی۔ ایسا بھی اس لئے ہوا کہ ذاتِ باری نے انہیں اپنے وجود سے آشنا کیا اور ان کے سامنے اپنے بھید لا کھڑے کئے جو اس تک پہنچانے والے ہیں۔"

صوفی مرشدوں کے تجزیے کے مطابق حضرت جنیدؒ کی تعلیمات کا مقصد یہ ہے کہ اس طرح جب ذاتِ الٰہی کی طلب میں وہ ذاتِ الٰہی کے وجود سے آشنا ہوئے اور ذاتِ باری اُن کے

نفوس رجیا گنگ تو وہ جیسے ہی ذات خدا وندی سے الگ ہوتے ہیں صرف ان کا مشاہدہ اور بصیرت ان سے الگ ہوتی ہے اور ایسا کبھی نہیں ہوتا کہ انسان کا وجود اللہ تعالیٰ کے وجود میں منتقل ہو جائے جبکہ فنائے صفت کے بعد اللہ تعالیٰ کے غلبے میں آجانے کا واضح مطلب یہ ہے کہ ایک انسان جب اپنی صفات سے گزر کر حالت الوہیت میں داخل ہوتا ہے اور خدا کی صفات خود خدا نہیں ہیں لہٰذا خدا کی صفت میں شامل ہو جانے کا مطلب خدا ہو جانا نہیں۔ اور حضرت جنیدؒ فرماتے ہیں کہ خدا کی صفات تو خدا نہیں ہیں خدا کو اس کی صفات کا ہم پلہ قرار دینا کفر ہے اس لئے کہ خدا تو دل سے ... میں نہیں اترتا، بلکہ انسان کے دل میں جو چیز اترتی ہے وہ خدا پر ایمان، اس کی وحدانیت ... اور اس کے ذکر کا تقدس ہے ... ایک عبادت گذار جب فنائے صفت سے گزرتا ہے ... تک آخری مقام پر آتا ہے جہاں اس کی انفرادیت ختم ہو جاتی ہے تو یہاں بھی وہ خدا سے ایک الگ وجود ہوتا ہے۔ بہت سے حجابات اگرچہ اٹھ چکے ہوتے ہیں لیکن ایک پردہ خالق اور انسان کے درمیان پھر بھی حائل رہتا ہے انسان کی یہ حالت تمنا اور امام سے ... ہوتی ہے۔ یہ درحقیقت امید و نا امید، سوز و کرب اور طلب الٰہی کی حالت ہوتی ہے اور ... کو برداشت کرنا ایک کڑا امتحان ہوتا ہے یہی وہ حالت ہے جس میں اللہ تعالیٰ اپنے عبادت گذار کی مدد کرتا ہے اور اسے آزمائش کی ایک ایسی حالت میں برقرار رکھتا ہے جہاں وہ اپنے ... ہونے کے باوجود وجود مطلق میں جذب نہیں ہوتا۔ اس آزمائش اور ابتلا کے مرحلے کے بارے میں حضرت جنیدؒ فرماتے ہیں کہ یہ روحیں اپنے آزمائش کنندہ کی طلب و آرزو ... اور اس مطلوب حقیقی کی جستجو ہی پر شکوہ سبب ہوتی ہیں انہیں اپنی محرومی اور ذلت کا غم تھا اور ... حالت ... کے لئے افسردگی اور دل شکستگی کا پیغام لائی چنانچہ وہ اس وجود ... کی خاطر ہمیشہ غمزدہ ... اس کے شوق میں سرگرداں رہیں اس حالت کے باوجود دوسری حالت اس پر طاری ہوئی ... پیاس، تشنگی اور اشتیاق کی حالت تھی یہاں تک کہ ان کے قلب و جگر ... پیاس شدید سے شدید تر ہو گئی اور وہ روحیں اس کی ذات معرفت کی دھن میں لگ گئیں پھر معرفت کی تلاش میں وہ اپنے آپ سے بھی گزر جانے پر آمادہ ہو گئیں۔ ذات حق کے لئے اس پیاس ... تمام ... ساتھ ... ان کے لباس کے ہر ٹکڑے کو نشان اور علم بنا دیا۔ اس ... ان کو خود ... کا بھی مزا چکھایا اور مشقت برداشت کرنے کے ایک ... تجربے سے دو چار کر دیا۔ حضرت جنیدؒ آزمائش الٰہی میں روح کے اس نئے تجربے جس میں سے وہ خود گذرے ہیں کے بارے میں بتاتے ہیں کہ روح انسانی اس بوجھ اور مشقت کو اس کی تمام تر ... کے ساتھ قبول کرتی ہے اور اسی میں اپنے لئے شفا تلاش کرتی ہے اس دوران بظاہر اپنے مسعود کے ... سے کٹی ہوتی ہے۔ ہر قدم ... اس کی نظر میں نزدیکی بن جاتا ہے اور یہ لطیف سے لطیف تر بنی باقی ہے ایسا اس لئے ہوتا ہے کہ اس پر سے حجاب اٹھ چکا ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ جب کسی کی آزمائش کرتا ہے تو یہ اس امتحان میں پیچھے نہیں ہٹتی اور ذات باری کے سامنے بیری کی حالت میں ہوتی ہے اور اس کے انعام اکرام کی امیدوار! جب ذات حق نے اس کو اس آزمائش میں سرفراز فرمایا تو یہ بھی اپنے آپ کو اس آزمائش کی راہ میں ہلاک کرنے کی آزادی دے دیتی ہے اور اس ذات کی محبت سے شاد کام ہو کر اور مقام تقرب پر اس کی محبت میں ڈوب کر اپنے آپ کے لئے ہر قسم کا اہتمام اور ہر طرح کا فکر ترک کر دیتی ہے اس موقع پر آنکھیں کہاں ... سے روشن ہوتی ہیں اس کا اندازہ ... کی حالت بیداری سے ہی کیا جا سکتا ہے۔ ... روحانی زندگی کی مدت اتنی بے پایاں ہوتی ہے اور آزمائش کی سختی اتنی شدید کہ ان روحوں کو اپنا ... گم کرنے میں کافی عرصہ درکار ہوتا ہے یہاں تک کہ یہی آزمائش ان کے لئے ایک مانوس و منسوب چیز بن جاتی ہے اور اس کی بھوک جاتی رہتی ہے چنانچہ یہ روحیں اس آزمائش اور امتحان کے بوجھ سے بالکل نہیں اکتاتیں اور نہ اس سے کبیدہ خاطر ہوتی ہیں یہ نفوس دراصل جوانمرد

اور بہادر ہوتے ہیں کہ جو کچھ ان پر گذرتی ہے اور جو کچھ انہیں پردۂ راز میں سونپا جاتا ہے وہ اس سے بڑی جوانمردی سے عہدہ برآ ہوتے ہیں یہ لوگ خدا کی آزمائش کے راہ میں ثابت قدم اور صابر رہتے ہیں۔ اور اس کے حکم کا انتظار کرتے ہیں۔

حضرت جنیدؒ کے یہ ارشادات درحقیقت ان کے نظریۂ توحید کی وضاحت کے سلسلے میں ہیں اور ان میں جو اسرار و رموز پوشیدہ ہیں ان سے یہ حکمت آشکار ہوتی ہے کہ جب ایک عبادت گذار اپنی صفات سے فنا ہو کر الوہی حالت میں آتا ہے اور پوری طرح اللہ تعالیٰ کے غلبے میں آجاتا ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ مکمل طور پر اپنے آپ کو اللہ تعالیٰ کے سپرد کر دیتا ہے چنانچہ اس مقام پر عام طور سے یہ غلط فہمی لاحق ہو جاتی ہے کہ جب عبادت گذار پوری طرح اللہ تعالیٰ کے غلبے میں آگیا ہے تو اس پر احکام الٰہی اور سوسائٹی کے قوانین کی پابندی ختم ہو جاتی ہے حضرت جنیدؒ اپنے نظریۂ توحید میں اس خیال کی تردید کرتے ہیں۔ چنانچہ قوانین اور احکام کے بارے میں مندرجہ بالا منفی رویے سے جو ذہنی آوارگی اور بے راہروی وجود میں آتی ہے اس کا حضرت جنیدؒ کے نزدیک توحید حقیقی سے کوئی بھی واسطہ نہیں۔ ایک شخص کے خدا کی رضا میں محصور رہنے سے احکامات کی عدم پابندی کے رویے پر حضرت جنیدؒ اس طرح اظہار خیال کرتے ہیں کہ یہ ان لوگوں کا عقیدہ ہے جو مذہبی اعمال کو بالکل بے وقعت خیال کرتے ہیں اور یہ میرے نزدیک ایک بھاری گناہ ہے۔ ایسا عقیدہ رکھنے والے شخص سے تو ایک زانی اور چور بھی میرے نزدیک بہتر ہے۔ دراصل جو لوگ اللہ تعالیٰ کی معرفت رکھتے ہیں وہ خدائی احکام دل سے سنتے ہیں اور ان پر عمل کر کے انہیں واپس اس کی جناب میں پیش کرتے ہیں۔ اگر میری عمر ایک ہزار برس بھی ہو تو میں یہ کبھی پسند نہیں کروں گا کہ اعمال خیر کے سلسلے میں ذرہ برابر بھی کمی ہو۔

حضرت جنیدؒ جب نظریۂ توحید پیش کرتے ہیں تو معرفت الٰہی کے صوفیانہ رویے کے حوالے سے ان دونوں پہلوؤں کو ساتھ ساتھ رکھتے ہیں جو فنائے صفت اور بحالی ہوش کے نظریات سے اس طرح مربوط ہیں کہ ایک کو دوسرے سے الگ کر کے مسئلہ حل نہیں کیا جا سکتا اور ان دونوں نظریوں فنائے صفت اور بحالی ہوش کو سمجھنے اور عمل کی بنیاد بنائے بغیر توحید حقیقی کا فہم حاصل ہونا ناممکن ہے۔ اس سلسلے میں صرف حضرت جنیدؒ ہی ایک ایسے قابل اعتماد صوفی رہنما ہیں جو اس اسرار کو نہ صرف کھولتے ہیں بلکہ فہم کا حصہ بنا دیتے ہیں۔ چنانچہ ہمیں ان کی تعلیمات پر یہ تینوں نظریۂ توحید، فنائے صفت اور بحالی ہوش چھائے ہوئے نظر آتے ہیں۔ توحید کی معرفت حاصل کرنے کے دوران وہ بڑے واضح انداز میں بتاتے ہیں کہ اگر مقصود خدا ہے تو اس مقصود تک رسائی کے لئے اپنی نفی شرط اولین ہے۔ اور اس راہ میں پیش آنے والے مرحلوں کی نزاکتوں سے اس طرح آگاہ کرتے ہیں کہ تصوف ایک سائنسی انداز سے سمجھ میں آنے لگتا ہے۔ مثال کے طور پر ان کے نزدیک فنائے صفت ذات کی مکمل نفی سے تعبیر ہے اور یہ مرحلہ اس وقت شدید نوعیت اختیار کر جاتا ہے جب عبادت گذار غلبۂ الٰہی اور اس کی محبت کے اشتیاق میں ہوش و حواس سے عاری ہو کر اپنے آپ کو اللہ کو سونپ دیتا ہے لہٰذا یہ مدہوشی کی حالت ہے جس کے اپنے تقاضے ہیں اور یہ حالت جسے حضرت جنیدؒ نے وجد آفرین مدہوشی کی اصطلاح میں بیان کیا ہے ایک نازک ترین مرحلہ ہے اور اس دوران فنا کا پورا عمل ناکام ہونے کا اندیشہ برابر موجود رہتا ہے۔ اگر صوفی توفیق الٰہی سے اس میں سرخرو ہو جائے تو وہ انعام اکرام کا حقدار ہوتا ہے بصورت دیگر اس کا ضبط نفس منتشر ہو جاتا ہے اور ذہنی توازن بگڑ جاتا ہے۔

جیسا کہ حضرت جنیدؒ فرماتے ہیں کہ فنائے صفت کا مطلب اپنی بصیرت اور عقل و ہوش سے مکمل دستبرداری کا نام ہے نتیجہ ہے خدا کی تلاش میں پُر الم کیفیات کو نعمت سمجھ کر قبول کرنے کا اور یہ ایک بہت بڑی آزمائش ہے لہٰذا اس ضمن میں حضرت جنیدؒ کا تجربہ اور مشاہدہ ہمیں بتاتا ہے کہ:

"خداتعالیٰ کے ساتھ اس حالتِ رفاقت میں انسان کا دائرہ کار کہاں سے کہاں تک ہوتا ہے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ یہ خدا کی طرف سے شروع ہو کر خدا ہی پر ختم ہو جاتا ہے۔ انسان کا وجود اسی ذاتِ حق کے لئے ہوتا ہے اور اسی کے ساتھ متحد ہو کر فنا ہو جاتا ہے۔ پھر اس کی ساتھ فنا بھی جاتی رہتی ہے۔ اور یہ اس لئے کہ اللہ تعالیٰ کا اس کے وجود کے بارے میں ایک منشا ہوتا ہے جو وہ اسے واپس عام انسانوں میں بھیج کر پورا کرتا ہے چنانچہ وہ اسے عام لوگوں کی طرح اس حال میں واپس بھیجتا ہے کہ اس پر اس کی نعمتوں کا اظہار پوری طرح عیاں ہوتا ہے اس کے ساتھ اس پر اللہ تعالیٰ کا یہ خاص کرم بھی ہوتا ہے کہ اس کی انفرادیت اسے واپس مل جاتی ہے تاکہ وہ عام لوگوں کو اپنی طرف کھینچ سکے۔

اسی سلسلے میں ایک اور جگہ وہ نفی اور وجود ثانوی کی گتھی کو سلجھاتے ہوئے بیان کرتے ہیں کہ "پھر جب اس کا وجود نہیں رہتا تو وہ وہاں موجود ہوتا ہے جہاں کہ وہ اس سے پہلے تھا وہ اپنے آپ میں واپس آجاتا ہے اور بعد اس کے وہ درحقیقت اپنے آپ میں نہیں رہا اس مقام پر وہ اپنے آپ میں موجود ہوتا ہے اور ذاتِ خداوندی میں بھی۔ حالانکہ اس سے پہلے وہ صرف ذاتِ حق ہی میں موجود تھا اپنے آپ میں نہیں تھا۔ اس لئے کہ وہ اب غلبۂ خداوندی کی سرشاری سے نکل کر حالتِ ہوش کی کھلی فضا میں آجاتا ہے اس کا مشاہدہ اسے واپس مل جاتا ہے۔ چنانچہ اب تمام چیزیں پھر اصلی حالت پر آجاتی ہیں۔ اور خود اس کو بھی اپنی پہلی صفات واپس مل جاتی ہیں۔ اس حالتِ فنا کے بعد اس کے اندر اس کی ذاتی صفات اور اس دنیا میں اس کے اعمال دوبارہ فعال موجود رہتے ہیں اور روحانیت کے اس مقامِ بلند کی انتہا کو پہنچ جانے کے بعد جب وہ واپس آتا ہے تو اس کا عمل دنیا داروں کے لئے پیروی کے لائق اور نمونہ ہوتا ہے۔"

روحانی زندگی کا یہ تجربہ جو حضرت جنیدؒ کی تحریروں میں نمایاں ہے درحقیقت تصوف کے اثباتی و تعمیری رویے کی تعبیر ہے جب ایک صوفی فنا کے تمام مراحل طے کر کے مدہوشی میں داخل ہوتا ہے جہاں اس کی روح ذاتِ خداوندی کے اندر اپنے وجودِ حقیقی میں واپس جانے کی تمنا کرتی ہے۔ حضرت جنیدؒ کے نزدیک حالتِ مدہوشی میں قیام ایک نامکمل روحانی تجربہ ہے کیونکہ جب تک اللہ تعالیٰ اسے اس کی صفات واپس کر کے ہوش واپس نہیں کرتا وہ اپنے گرد و پیش کی بھلائی کے لئے کام نہیں کر سکتا اور نہ ہی احکاماتِ الٰہی کی مکمل پیروی کر سکتا ہے۔ چنانچہ جنیدؒ مشرب کے مطابق ایک صوفی حالتِ ہوش میں ہی اپنے معاشرے کے لئے خیر و برکت کا باعث بن سکتا ہے چونکہ اس نے حضورِ حق میں اس کی ذات میں کھو کر ایک مرحلہ گزارا ہوتا ہے اور جب وہ واپس ہوش کی حالت میں آتا ہے تو فنا کا تجربہ ضائع نہیں ہوتا بلکہ اس کے اندر پوشیدہ ہوتا ہے۔ اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے آزمائش میں ثابت قدم رہنے کے عوض اسے جو انعام و اکرام ملتا ہے اس سے وہ بندگانِ خدا ہی برابر کا شریک کرتا ہے۔ یہاں ایک اور منظر حضرت جنیدؒ بیان کرتے ہیں کہ اس حالت میں وہ حاضر بھی ہوتا ہے اور غائب بھی۔ حاضر اور غائب کی کیفیات کو حضرت جنیدؒ نے اپنی ایک نظم میں ظاہر کیا ہے۔ لکھتے ہیں۔

"جو کچھ میرے اندر تھا۔ وہ میں نے پالیا ہے۔
میری زبان تجھ سے پردۂ راز میں ہمکلام ہوئی۔
اور ہم دونوں ایک طرح سے متحد ہو گئے لیکن ایک دوسرے اعتبار سے ہم ایک دوسرے سے جدا ہیں اور اگرچہ رعب و ہیبت نے تجھے میری ان آنکھوں سے پوشیدہ رکھا ہے لیکن جذبہ وجد و انبساط نے تجھے میرے سب سے قریبی جسم کے حصے سے بھی قریب تر کر دیا۔"

فنائے صفت کے بارے میں حضرت جنیدؒ نے ایک یہ تجربہ بھی بیان کیا ہے کہ جب وہ فنائے صفت کے مراحل سے گزر کر فنا کے آخری مقام پر پہنچے تو ان کی روح ذاتِ خداوندی کی طرف واپس جانے کے لئے غمزدہ اور بے چین رہنے لگی اور یوں محسوس کرتی تھی جیسے اسے اللہ تعالیٰ کی حضوری اور اس کی ذات میں رہنے کی اس حالت سے دور کر دیا گیا ہو جو اسے پہلے میسر تھی۔

حالتِ فنا اور حالتِ ہوش کے بارے میں حضرت جنیدؒ کے تجربے اور حکمت افروز تعلیمات درحقیقت صوفیانہ زندگی کی تکمیل کا پروسس ہیں اور ان نازک اور نہ سمجھ کرنے والے مراحل کو جس روحانی بصیرت اور الہامی کلام سے حضرت جنیدؒ نے آنے والی نسلوں تک منتقل کیا ہے ایک واضح اور روشن ضابطۂ تصوف ہے جس سے یہ بصیرت حاصل ہوتی ہے کہ مدہوشی کی حالت میں کوئی صوفی اس معیار پر نہیں آسکتا جو حالتِ ہوش میں ہی نصیب ہوتا ہے اور حضرت داتا صاحبؒ اپنے نظریاتی مرشد حضرت جنیدؒ کے نظریۂ ہوش کی اس طرح وضاحت کرتے ہیں کہ مدہوشی برائی ہے اس لئے کہ اس میں انسان کی عمومی حالت مضطرب ہو جاتی ہے عقل و خرد و حس منہدم ہو جاتی ہے اور تخلیق کا اصول بھی اسی وقت قائم رہ سکتا ہے جب خدا کو تلاش کرنے والا حالتِ ہوش میں نہ آجائے۔ کیونکہ بے بصیری کے عالم میں لوگ خارجی مظاہر میں گم ہو کر خدا کو بھول جاتے ہیں اس لئے کہ چیزیں انہیں اس طرح نظر نہیں آتیں جیسی کہ وہ حقیقت میں ہیں۔ حضرت داتا صاحبؒ اپنے مرشد کی پیروی میں فرماتے ہیں کہ مدہوشی تو بچوں کا کھیل ہے اور حالتِ ہوش میدانِ کارزار و شہادت گہہ مرداں ہے۔ اور میں بھی کہتا ہوں کہ ایک ایسا انسان جو مدہوش اور بے خود رہ چکا ہے اس کی حالتِ کمال یہ ہے کہ وہ ہوش میں آجائے۔

حضرت جنیدؒ کے نظریۂ ہوش کا نچوڑ یہ ہے کہ انسان جب فنا ہو کر اللہ تعالیٰ کے اندر جاودانی زندگی حاصل کرتا ہے تو یہ خیر و نیکی کی راہ میں اس کا ایک ذاتی انعام ہوتا ہے جو اسے اللہ تعالیٰ کی طرف سے عطا ہوتا ہے لیکن اللہ تعالیٰ کی منشا یہ ہوتی ہے کہ وہ باطنی تجربے جو اسے حاصل ہوتے ہیں ان کی روشنی میں خلق کو ان تجربوں میں پوشیدہ نیکی اور پاکیزگی سے فیضیاب کرے۔ چنانچہ صوفی کا حالتِ مدہوشی سے حالتِ ہوش میں آنے کا اصل مقصد صرف یہ ہے کہ وہ جب ہوش و حواس، فہم و بصیرت اور عقل و فراست سے دوبارہ بہرہ ور ہو تو اپنے آس پاس کی فضاؤں میں بسنے والوں کا دوست، خیرخواہ، ہمدرد، رہنما اور ایثار کرنے والا بن جائے۔ سوسائٹی میں اپنا صوفیانہ کردار اس سطح پر ادا کرے کہ وہ دینی معاملات میں ایک معلمِ دین کی حیثیت سے لوگوں کی رہنمائی کر سکے اور خدا کی تلاش میں سرگرم سفر انسانوں کو اپنے اصل واضح تجربوں میں شریک کرے لہٰذا یہ تمام اہم فرائض حالتِ ہوش میں ہی ادا ہو سکتے ہیں۔"

صوفی کی حالتِ ہوش کے پردے میں ایک اور پوشیدہ کیفیت بھی ہے جسے حضرت جنیدؒ نے ایک فنی مسئلے کے طور پر بیان کیا ہے جو ہمیں خاص روحانی احساسات کی لہروں سے آشنا کرتا ہے اور تصوف میں انتہائی نازک مرحلہ ہے۔ جو بتاتا ہے کہ مدہوشی میں جہاں انسان سے اس کا سب کچھ چھین جاتا ہے اور اللہ تعالیٰ اسے ہر آزمائش میں ثابت قدم پا کر انعام و اکرام کی صورت میں اسے ہوش و حواس واپس کرتا ہے تو ہوش و حواس کی دنیا میں آکر بھی صوفی باطنی طور پر بے چین ہوتا ہے یہ کیسی بے چینی ہے؟ جب کہ وہ توحیدِ الٰہی کے اندر مدغم ہونے کا تجربہ حاصل کر چکا ہوتا ہے؟ حضرت جنیدؒ اس کا جواب یوں بیان کرتے ہیں: "جب اللہ تعالیٰ ان افراد کو واپس ان کی انفرادی حالت میں بھیج دیتا ہے اور ہر روح کو اپنی نوع میں لوٹا دیتا ہے تو وہ اس نئی حالت کو بطور ایک ظاہری پردے کے استعمال کرتی ہے جس کے پیچھے وہ اپنی گذشتہ حالت چھپائے رکھتی ہے جس میں کہ وہ اس سے پہلے تھی۔ اس نئی حالت میں وہ بے چینی اور بے بسی کی حالت میں ہوتی ہے اور اپنی نوع کے ساتھ مانوس ہونے کی کوشش کرتی ہے جب اللہ تعالیٰ نے اسے اس حالتِ کمال اور مقامِ عزت و احترام سے محروم کر دیا اور اسے علم و تفکر کی راہوں میں واپس لے جا کر چھوڑ دیا ہے تو قدرتی طور پر اس کے دل میں حسرت کا بسیرا ہو جاتا ہے اور اس حالتِ کمال کے کھو جانے کا غم اسے برابر لگا رہتا ہے جس کی وجہ سے یہ

دروح مسلسل ترامیش اور آمد ورفت میں رہتی ہے اور اس دنیوی حالت کو اس کی یہ واپسی کیوں نہ اس کے دل پر زخم لگائے جبکہ وہ ایک دفعہ غائب ہونے کا تجربہ کر چکا ہے اور اتحاد الٰہی کی رنگینی سے بہت دفعہ مالا مال ہو جانے کے بعد یہ کیوں نہ پھر اس چیز کی آرزو کرے۔

حضرت جنید اس بے چینی اور مسلسل آرزو کی نشاندہی صوفیوں کے رد عمل سے کرتے ہیں جب وہ مناظر قدرت، سرسبز و شاداب وادیاں، خوبصورت جنگلوں اور نظر فریب مناظر میں بہت دلچسپی لینے لگتے ہیں اور یوں بھی صوفیہ کی زندگی کا مطالعہ بتاتا ہے کہ ان مناظر کو دیکھ کر صوفی بچھڑے ہوئے محبوب کی یادوں کو تازہ کر سکتا ہے۔ اور صوفیانہ شاعری اس آرزوئے مسلسل کا تخلیقی اظہار ہے۔ حضرت جنیدؒ فرماتے ہیں۔

"یہی وجہ ہے کہ عارفوں کے دل عموماً شاداب مقامات، خوبصورت مناظر اور فطرت کے شاہکاروں کی طرف ہی مائل رہتے ہیں اور اس دنیا میں اس کے علاوہ جو کچھ بھی ہے وہ ان کے لئے عذاب ثابت ہوتا ہے جس کے اندر رہ کر وہ اپنی حالتِ اولیٰ میں لوٹنے کی تمنا کیا کرتے ہیں۔ اس حالت کو جس پر پردہ ہائے حجیب پڑے ہیں اور جو سراسر محبوب کے ہاتھ میں ہے۔"

مشرکے ڈاکٹر علی حسن عبدالقادر حضرت جنیدؒ کے نظریۂ ہوش کے بارے میں لکھتے ہیں کہ حضرت جنیدؒ کی یہ تعلیم اور اس کے معاملے میں ان کا رویہ دونوں ہی بے مثل چیزیں ہیں۔ تصوف کی تاریخ میں عموماً ہمیں ایسے صوفیہ ملتے ہیں جو ذاتِ خداوندی کے ساتھ متحد ہونے اور اسی طرح ذاتِ مطلق کے غالب کا تذکرہ کرتے ہیں اس ضمن میں ہمیشہ اس چیز کا اندیشہ ہوتا ہے کہ ایک انسان جسے خدا نے اتنی عزت بخشی ہو، وہ اپنی سوسائٹی سے بالکل ہی الگ تھلگ ہو جائے اور دنیا جہان سے کنارہ کرے۔ یہ درست ہے کہ بعض صوفی اپنی ہیئتِ اجتماعی کی طرف مرشد و رہنما بن کر اور بعض اوقات کسی نئے مدرسہ کے بانی بن کر واپس آتے ہیں لیکن یہ ایک بہت ہی نادر الوقوع چیز ہے کہ ایک صوفی ایک ایسا انسان جو صوفیانہ تجربوں کے تمام مراحل سے گذر چکا ہو، وہ اپنے آپ کو اپنے تجربے سے اتنا آگے لے جائے جتنا کہ حضرت جنیدؒ لے گئے اور اللہ تعالیٰ کے ساتھ اپنے کامل اتحاد کی حالت اور اس کے علاوہ اپنے آپ اور دنیا میں واپس آنے کی کیفیت کے بارے میں ایک واضح نظریہ پیش کرے۔ انسانی سوسائٹی میں ایک صوفی کی واپسی ایک بدلے ہوئے کامل تر وجود کی حالت میں یہ وہ چیز ہے جو حضرت جنیدؒ کے نظریۂ ہوش کا مقصد اور نچوڑ ہے۔ لہٰذا ایک صوفی کا یہ رویہ انسانی تہذیب کے لئے کسی طرح بھی منفی قرار نہیں دیا جا سکتا۔ رہا یہ مسئلہ کہ حضرت جنیدؒ کا سا بے مثال اور اعلیٰ مذہبی تجربے رکھنے والے اور خدا تعالیٰ کے ساتھ اتنا قرب اور ذاتی تعلق رکھنے والے دوسرے اصحاب حضرت جنیدؒ کی مثال کو سامنے رکھتے ہوئے سوسائٹی میں بھی لوٹ کر واپس آئیں گے تاکہ یہاں آ کر اپنے ہم جنس انسانوں کی خدمت کر سکیں۔ یہ ایک ایسی چیز ہے جس کی انسانی کوشش و عمل میں بڑی اہمیت ہے۔ ایسے لوگ یقیناً اس قابل ہوں گے کہ بیک وقت وہ ذاتِ خداوندی کی امانت سنبھالیں اور دوسری طرف حالتِ ہوش میں دنیاوی کاموں سے عہدہ برآ ہوں اور ہادی ہوں۔

معرفتِ الٰہی

حضرت جنیدؒ کا معرفت کے بارے میں ارشاد ہے۔

"مجھ سے معرفتِ الٰہی کے بارے میں سوال کیا گیا ہے کہ معرفتِ الٰہی کیسے حاصل کی جاتی ہے میرا جواب یہ ہے کہ چونکہ اس علم کا موضوع ایک ہی ہے، اس لئے معرفتِ خداوندی چاہے وہ ایک ولی کو حاصل ہو یا ایک عام آدمی کو، ایک ہی نوعیت کی چیز ہے البتہ اس کے درجے الگ الگ ہیں اور یہ ظاہر بات ہے کہ ایک ولی اللہ کو دوسرے لوگوں کی نسبت زیادہ گہرا علم ہوتا ہے تاہم حالت فرق کر کمال علم کسی صورت ہو ممکن نہیں اس لئے کہ وہ ذات غیر محدود ہے اور معرفت انسان کے اندر اپنی انتہا کو پہنچ سکتی ہے اس لئے کہ ذریعہ علم عقل ہے اور عقل اور تخیل اپنی فطرت کے لحاظ سے محدود ہیں۔

انسان کی مخلوق ہیں۔ عام لوگوں کو اس کی ذات کا معرفت حاصل ہے وہ یہ کہتے ہیں سب تک گئے ہیں کہ وہ اس ذات عظمت کا اس بنا پر بیان کرنے کو مضمون کی اس کی اصل حقیقت سے آگاہ ہونے میں ناکام رہ جاتے ہیں۔ وہ جانتے ہیں کہ وہ ذات اپنی حقیقت میں یکتا اور لاثانی ہے اور وہ اس کا اپنی فعل سے حافظہ نہیں کر سکتا اسے اپنا لے گا۔ وہ دا ئمی ہے وہ دوسری سادہ ساری مخلوق تک دریے میں آتی ہیں جو فانی ہیں وہ ابد لاباد اور دوسرے سب مظاہر جو وہ عالم اعلیٰ ہے اور سب کے تابع اور محکوم ہیں۔ وہ قدرت و جبروت والا ہے اور خودی کی قوت تمام حقیقت اور اس کے سوا تمام چیز اس کی ربوبیت سے تو ہے وہ سب کچھ جانتا ہے بغیر اس کے کہ کوئی اس کو اس سے آگاہ کرے اس کو یہ ضرورت نہیں کہ وہ اپنے سوا کسی دوسرے جز کا محتاج یا مدد لے۔ وہ بلا واسطہ علم رکھتا ہے اس کا سرچشمہ اللہ تعالیٰ ہی ہے۔ فقط لطیف ہوا اس ذات کی بزرگی ہے بغیر ابتدا کے ہے اور ابد کا بغیر انتہا کے۔ یہ سارا معرف اور بیان صرف اسی ذات کے بارے میں ہی ہو سکتا ہے اور یہ صرف اسی کا حق ہے۔

تو اس سے یہ نتیجہ نکلا کہ اللہ تعالیٰ کے اولیا اور برگزیدہ بندوں کو اس کی معرفت کا ایک بہت ہی بلند درجہ حاصل ہوتا ہے اگرچہ معرفت نامکمل ہوتی ہے اور ایک آدمی جاہے وہ بادشاہ ہو اور خواہ بھی ہو یہ معرفت ایک کمتر درجے میں رکھتا ہے لیکن چونکہ یہ مختلف درجوں میں دونوں قسم کے انسانوں کے یہاں پائی جاتی ہے اس لئے اس دونوں قسم کے انسانوں کے اندر اس علم کے مظاہر کی نوعیت کے بارے میں تحقیقات ہو سکتی ہے۔

علم الٰہی اپنی پہلی اور عام حالت میں یوں ظاہر ہوتا ہے کہ انسان ذاتِ الٰہی کی وحدانیت کا اعلان کرتا ہے اور اسے لاشریک قرار دیتا ہے، اس کے وجود پر کامل ایمان رکھتا ہے اور قرآن حکیم اور اس کے اندر وارد شدہ احکام خداوندی کو تسلیم کرتا ہے۔ معرفت بھی اپنے بلند ترین مدارج میں نیکوکاری، ہر لمحہ خوف الٰہی اور مخلوقات کے اندر جلوۂ خداوندی کے مشاہدے کی صورت میں ظاہر ہوتی ہے اسی حالت میں انسان اخلاق کا ایک نہایت اعلیٰ معیار قائم کرتا ہے اور جس چیز سے خدا نے منع کیا ہے اس سے مکمل اجتناب کرتا ہے۔

اب معرفتِ الٰہی کا وہ درجہ جو خواص کو حاصل ہوتا ہے وہ ایک عام آدمی کے درجے کی نسبت زیادہ شدید اور قوی ہوتا ہے اور اس شدت کا دارومدار اس بات پر ہوتا ہے کہ وہ لوگ ذاتِ خداوندی اس کی عظمت و شان، اس کی قدرت کاملہ، اس کے علم محیط، اس کے دائمی جود و سخا، اس کی رفعت شان اور اس کی سروری و برتری کا تصور اس کی معرفت میں کس حد تک کر سکتے ہیں۔ اپنے اسی تصور کے اعتبار سے وہ اس کے مقام سروری، اس کی حاکمیت کی برتری، اس کی بارگاہ کے آدابِ اطاعت و عبودیت، اس کی قدرت کاملہ، اس کی سزاؤں کی تاثیر اور کاملیت اور اس کے انعامات کی وسیع دامنی، جنت میں اس کی فیاضی اور صفتِ رحمانی، اس کی رحیمی، اس کے انعامات کی کثرت، اس کی عنایت و شفقت، اس کے تقربِ صالحہ، اس کے کرم و رحم غرض اس کی ان ساری صفات سے وہ آگاہی حاصل کرتے ہیں۔ ان صفات کا تصور ان کے یہاں جتنا شدید اور گہرا ہوتا ہے وہ اتنا ہی اس کی تمجید کا فرض ادا کرتے ہیں۔ اس کی تعظیم و تکریم بجا لاتے ہیں اسی احساس کے ساتھ محبت رکھتے ہیں وہ خدا کے سامنے بالکل متحیر و درماندہ ہوتے ہیں وہ اس سے خوف بھی کھاتے ہیں اور اس کی نعمتوں کے امیدوار بھی ہوتے ہیں وہ اس کے احکام کی پیروی کرتے ہیں اور جن باتوں سے انہیں روکا جاتا ہے ان سے وہ اجتناب بھی کرتے ہیں، وہ اپنا جسم اور اپنا ذہن دونوں خدا کے حوالے کر دیتے ہیں اور اس راستے میں سرِ الٰہی

کی کبریائی اس کی ذات کی سروری اور اس کے انعامات کی فراوانی اور اس کی سزاؤں کی تاثیر کا احساس اُن کے لئے مہمیز کا کام دیتا ہے۔ یہ لوگ خواص کہلاتے ہیں اور اس کے دل اور مقرب ہوتے ہیں۔

اس لئے لوگ کسی شخص کے متعلق کہہ دیتے ہیں کہ وہ عارف باللہ ہے یا عالم باللہ! مسلمانوں کے درمیان جب ایک شخص کو دیکھا جائے کہ وہ خدا کی حمد و ثنا و بیان کرے، بات اس کی تسبیح و کرم میں ہو ہے اس سے خائف ہے اور اس سے امید بھی وابستہ رکھتا ہے اس کی جستجو کرتا ہے اور اس کے لئے سراپا شوق بنا ہوا ہے، نیک عمل کرتا ہے آنسو بہاتا ہے اور گناہوں پر غمزدہ رہتا ہے۔ نہایت عجز و انکسار کے ساتھ خدا کا تقرب چاہتا ہے تو اس شخص کے بارے میں یہ مان لیا جاتا ہے کہ اس کو اللہ تعالیٰ کی جو معرفت حاصل ہے، قرآن حکیم میں ایسے اشخاص کا ذکر اس طرح آیا ہے۔

"اللہ کے بندوں میں سے اس سے ڈرنے والے تو اہلِ علم ہی ہوتے ہیں"۔

ایک ایسا شخص جسے معرفت الٰہی اپنی حقیقی صورت میں میسر آگئی اس علم کے تقاضے بھی اس پر لازم ہو گئے اور وہ عمل کے لئے پوری طرح کمربستہ ہو گیا۔ وہ دیکھتا ہے کہ اس معاملۂ عمل کے بارے میں اس کی صفتِ انسانی اور معرفتِ الٰہی کے درمیان موافقت نہیں ہے تو وہ ان دونوں کے اختلاف کی تلافی اپنی ساحر باتوں، توجہ اور آمادگی سے ظاہر کرتا ہے۔ وہ جانتا ہے کہ اس سفر کا توجہ اور آمادگی کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کرنے کا مقصد کیا ہوتا ہے۔ چنانچہ اس حال میں اس پر نہایت درجہ انکساری، تواضع کمتری، حقیرت، احتیاج اور ذلتِ سوال کی کیفیت طاری ہو جاتی ہے جو اس پر سے معرفتِ الٰہی کا بوجھ ہلکا کر دیتی ہے۔ چنانچہ جب علمِ ثانی (یعنی معرفتِ اُخروی) کی منزل اس کے سامنے آتی ہے تو وہ اپنے آپ کو موجود پاتا ہے۔ اس کی صفات اب اس علمِ ثانی کے مطابق عمل کرنے کے لئے تیار ہو جاتی ہے وہ اب علمِ اوّل (یعنی معرفتِ اوّلی) کی حقیقت کو جس کی مدد سے وہ سب سے پہلے آمادۂ عمل ہوا تھا اپنے سامنے موجود نہیں پاتا اس لئے کہ اس علمِ اوّل کے احکام کی شرائط اب اس کے لئے بہت ثقیل اور بوجھل ہو جاتی ہیں۔

اس مرحلے پر وہ اپنی صفاتِ انسانی از قسم خواہشاتِ نفس وغیرہ سے نکل کر ایسے مقام پر پہنچ جاتا ہے جہاں اس کی خواہشات کے معدوم ہو جانے سے اس کی صفات پر صفا و پاکیزگی کا حکم واقع ہو جاتا ہے چنانچہ وہ زندگی کے واقعات و حوادث اور اشیائے عالم کی بوقلمونیوں سے اپنے لئے ذاتِ حق کی طرف اشارہ ہی پاتا ہے اس لئے کہ درمیان واسطے ختم ہو جاتے ہیں اور اس کی قوتِ فیصلہ و تمیز اس کی لطافت وجدان اور پاکیزگیٔ صفات اس کے ساتھ منطبق ہو جاتی ہے۔

جب انسان اس منزل پر پہنچ جاتا ہے تو وہ ایسے وجود کی صفت سے نکل جاتا ہے جو عقلی اصطلاحوں میں بیان کی جا سکے۔ پس حقیقتِ توحید حاصل ہو گئی تو عوارضِ حقیقی محض وسوسے بن کر رہ گئے جو اس قابل ہیں کہ رد کر دیئے جائیں، اس لئے کہ عقلِ انسان کی اس وقت تک نگران تھی جب تک کہ انسان بحیثیت ایک عبد کے عبودیت کی منزل میں تھا لیکن جب ذاتِ خداوندی کے غلبہ و تسلط کی کیفیت راسخ ہو گئی تو اب وہ بندہ اپنی بندگی میں ایک اور ہی جنس بن جاتا ہے، وہ اس کی پہلی جنس باقی نہیں رہتی۔ خارجی صفات کے اعتبار سے وہ موجود ہوتا ہے لیکن داخلی حالت میں وہ بالکل گم اور معدوم ہوتا ہے گویا وہ ایک ہی وقت میں موجود بھی ہوتا ہے اور غیر موجود بھی۔

جب معرفتِ الٰہی کی گہرائی تم کو ایک بلند مرتبہ پر فائز کر دیتی ہے اور تمہارا دل اس معرفت کے نور سے بھر جاتا ہے تمہیں اس ذات کی بندگی اور خدمت میں خوشی حاصل ہونے لگتی ہے اس کے ذکر سے تمہارا ذہن جلا پاتا ہے اور تمہاری فہم و فراست کا دار و مدار اسی ذات پر ہوتا ہے تو اس وقت تمہارا انسانی وجود ختم ہو جاتا ہے۔ تمہاری نفسانیت زائل ہو جاتی ہے اور تمہاری معرفت کو نور عطا ہوتا ہے اس لئے کہ اس کا ماخذ اب اللہ تعالیٰ کی ذات ہوتی ہے اور علمِ الٰہی تمہارے سامنے آموجود ہوتا ہے۔

"توحیدِ الٰہی کا علم توحید کے احساس اور تجربے سے ایک مختلف چیز ہے اور توحید کا احساس اس کی یافت توحید کے علم سے ایک الگ چیز ہے"۔

معرفتِ الٰہی اور علم فروشی

نورِ معرفت ایک ایسا راز ہے کہ عقلِ انسانی اس کی نشاندہی کرنے کی کوشش میں عاجز ہو جاتی ہے اور ذہنِ انسانی اس کو سمجھنے کی جد و جہد میں عاجز و درماندہ ثابت ہوتا ہے اس کا سمجھنا بعید اور بہت ہی بعید ہے۔ بڑے بڑے علماء کی قابلیتیں اس میں ناکام ہو گئیں اور تمام اہلِ دانش و حکمت کی سعی اس راہ میں گم ہو گئی اس لئے کہ اللہ تعالیٰ بے مثل ہے، یکتا ہے، وتر ہے اور اپنا مشاہدہ کرانے سے انکار کر کے وہ اپنے وجود کی حقیقت کو انسان کی نظروں سے اوجھل کر دیتا ہے۔ بس کہتے ہیں کہ محض خیال و وہم کی بناء پر اس کی طرف اشارہ کر پاتے ہیں اور سکتے ہیں جو اس کی بابت یقین سے کچھ اظہار کر سکتے ہیں پھر جب ان میں سے کوئی اس کے بارے میں اظہار کرتا ہے تو اس کی زبان بہکی جاتی ہے اور وہ اس کا وصف بیان کرتے ہوئے حیرت میں گم ہو جاتا ہے۔ جب کوئی جاہل اس شخص کی بات سنتا ہے تو سمجھتا ہے کہ شاید وہ صحیح بات کہہ رہا ہے حالانکہ وہ اپنی تقریر میں بالکل اندھیرے اور تاریکی میں الجھا ہوتا ہے وہ ایک دعویٰ کرتا ہے اور اللہ تعالیٰ کی اصل حقیقت اسے جھٹلاتی ہے۔ وہ اپنے سامع کو اپنی سچائی کا اس طرح یقین دلاتا ہے کہ جن اعمال کی بجا آوری کا اور جن اعمال سے اجتناب کا حکم دیا گیا ہے ان کے بارے میں وہ جان کر ایسی باتیں کرتا ہے جو سمجھ میں آنے والی ہوں اور یہ "علم" کا کچھ حق ہے اس پر جو اس کا نام لیوا اور اس کی ذمہ داری کا بوجھ اٹھانے والا ہو۔ دلیل کہ جب تم اپنے نفس کے لئے علم کا تقاضا کرتے ہو تو وہ علم تمہارے نفس کو حاصل ہو جاتا ہے۔ بیشتر اس کے کہ تم اس علم کا حق ادا کرو، یہ علمی فرض ایک ایسا فریضہ ہے کہ اس کا اصل نفع اور اس کا حقیقی نور تم پر نمایاں نہیں ہوتے۔ صرف اس کا ظاہر اور اس کی رسمی شکل تمہارے سامنے ہوتی ہے اور اس حالت میں علم کی سبب تم پر قائم ہو جاتی ہے چاہے تمہارے یہاں محض اس کی ظاہری شکل ہی موجود ہو۔ پس اے وہ شخص جس نے علم کا محض ظاہری لباس پہن رکھا ہے اور دیکھنے والوں نے بس کے اس لباس کے حسن و زیبائش کی تعریف و توصیف کی ہے حالانکہ تم علم کی اصل حقیقت سے بہت پیچھے ہو جب تک تم اس حال میں ہو کہ لوگوں کی انگلیاں تحسین و آفرین کے ساتھ تمہاری طرف اٹھی ہوئی ہیں اور ان کی زبانیں تمہاری طرف سے مرطوب ہیں تو یہ حالت تمہارے لئے ہلاکت سے کم نہیں اور یہ آخرت میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے تم پر حجت ہو گی۔

جب عالم نے دانا و حکیم کی یہ تقریر سنی اور اس کا سارا بیان اور تشریح اس کی سمجھ میں آگئی تو اس کی گردن جھک گئی اور وہ سوچ میں ڈوب گیا۔ پھر اس پر گریہ طاری ہوا اور وہ بہت دیر تک روتا رہا اور آہ و زاری کرتا رہا۔ اس کا اضطراب بہت شدت اختیار کر گیا اس پر وہ دانا و حکیم اس شخص کی طرف متوجہ ہوا اور کہنے لگا۔

اب جب کہ حکمت و دانائی کا سورج تم پر طلوع ہو چکا ہے اور اس کا صاف اور اُجلا نور تم تک پہنچ گیا ہے تو امید ہے کہ اب تم سے اس علم کے اندھیارے چھٹ جائیں گے جن سے معاملے میں تم اب تک غافل رہے ہو اور جو تمہاری فہم کے راستے میں مانع رہے ہیں اور میں امید کرتا ہوں کہ تمہارے اندر جو فساد تھا اب درست ہو جائے گا اور جو کچھ تم نے اب تک ضائع

کیا ہے اس کی تلافی ہو جائے گی۔"

جب عالم نے دانا و حکیم شخص کو اپنی طرف متوجہ پایا تو اس کا اضطراب سکون میں بدل گیا۔ وہ رکا مو قوف کی اور کہنے لگا۔

"اے دانا انسان! اپنے حیلۂ لطیف اور حکمتِ مخفی سے کام لیتے ہوئے مجھے اس چیز کے وبال سے نجات دلائیں اور شر کی مخفی خواہش جو میرے باطن میں پوشیدہ ہے اور مجھ سے اوجھل ہے وہ یوں کہ اس سے پہلے کچھ چھپی ہوئی چیزیں ایسی تھیں جو اس دل کے اندر پوشیدہ تھیں اور تم نے بیانِ جمیل اور ارشاد فرمایا تو ان کا راز مجھ پر ظاہر ہوا!

دانا انسان نے اس کے جواب میں کہا "خدائے قدوس نے تم پر یہ جو نوازش کی ہے اور تمہیں اپنی کمزوریوں سے آگاہ اور نفس کے خزانوں سے مطلع کیا ہے تو اس پر اس کی حمد کرو اور اس کے سامنے انتہائی عاجزی کے ساتھ جھک جاؤ اور نہایت بے بسی اور درماندگی کے انداز میں اس سے اپنی احتیاج طلب کرو۔ اس لئے کہ تمہاری مناجات اس کے حضور میں کبھی پوشیدہ نہ رہے گی بلکہ سنی جائے گی اور جب تم ان باتوں پر عمل کرو گے تو یہ عمل اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں تمہاری شفاعت کرے گا اس کے ساتھ یہ بھی جان لو کہ حکمت و دانائی کی زبانیں اس وقت تک کلام نہیں کرتیں جب تک انہیں ایسا کرنے کا اذن حاصل نہ ہو۔ اور جب تم اس اذن کے بعد بولو گے تو پھر بھی سننے گا اس سے نفع پائے گا۔ اپنی مخلوق پر اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم کی مثال ایسی ہے جیسے اس کے آسمان سے اترنے والی بارش جس سے وہ مردہ زمینوں کو پھر سے زندہ کر دیتا ہے۔ کیا تم نے خدا کا یہ ارشاد نہیں سنا کہ:

"پس (اے دیکھنے والے) خدا تعالیٰ کی رحمت کی نشانیوں کی طرف دیکھ کہ وہ کس طرح زمین کو اس کے مرنے کے بعد زندہ کر دیتا ہے۔ بے شک وہ انسانوں کو بھی بعد مرنے کے زندہ کرنے والا ہے اور ہر چیز پر قادر ہے۔"

اسی طرح اللہ تعالیٰ حکمت و دانائی کی زبان سے اہلِ غفلت کے دلوں کو۔ جو خدا سے روگردانی کے باعث مردہ ہو چکے ہوتے ہیں پھر سے زندہ کرتا ہے۔"

اس پر عالم نے دانا آدمی سے کہا: "ہاں بے شک تم نے جو کچھ کہا وہ اسی طرح ہی ہے جس طرح تم نے اس کی تشریح کی ہے اور میں امید کرتا ہوں کہ تم اپنی رہنمائی سے مجھے خسارے اور گناہ کے وبال سے بچاؤ گے اپنی ملاقات و صحبت کے ذریعے انحطاط کی ذلت سے نکالو گے۔ پس اے دانا انسان! تو میرے ان پوشیدہ رازوں سے مجھ سے زیادہ واقف ہے اور اب پردے اٹھا رہے اس لئے کہ ایک مریض کو اپنے مرض کا اتنا پتا نہیں ہوتا جتنا ایک معالج کو ہوتا ہے اور ایک معالج ہی کو یہ حق پہنچتا ہے کہ وہ ایسی دوا بھی تجویز کرے جو اس مریض کی شفا کا باعث ہو۔"

دانا انسان نے جواب دیا: "اب فہم کے آثار تجھ پر ظاہر ہونے لگے ہیں جس سے تم یہ سمجھ لو کہ تم پر کیا چیز غالب ہے اور تمہارا کس چیز پر حق ہے۔ صحیح ہوشمندی کی ابتدائی نشانیاں تمہاری عقل پر عیاں ہونے لگی ہیں اور دانائی کی علامت آہستہ آہستہ تمہارے باطن میں متحرک ہونے لگی ہے۔ جان لو کہ دین و ایمان کا ضرر جسم و جان کے ضرر سے بدتر ہوتا ہے اور اعضا و اجسام کے عوارض قلب و فہم کی بیماریوں سے زیادہ آسان ہوتے ہیں اس لئے کہ دین کی بیماریاں اور یقین کے راستے میں حائل ہونے والی آفات ہلاکت کا سبب، آگ میں جھونکے جانے کا باعث اور خدائے جبار کی ناراضگی کا موجب ہوتی ہیں اور ان کے ماسوا جو علل و عوارض ہوتے ہیں ان کے نتائج یہ نہیں ہوا کرتے اگر انسان جسم و جان کی بیماریوں میں مبتلا بھی ہو جائے تو یہ ایسا ضرر ہے کہ جس کی شفایابی اور جس کی اذیت کے دور ہونے کی توقع کی جا سکتی ہے اور ان پر صبر کرنے سے اللہ تعالیٰ کے اجر و ثواب کی امید بھی کی جا سکتی ہے یہ بھی جان لو کہ ایک ماہر اور تجربہ کار طبیب جسمانی بیماریوں کا اور ایک نصیحت کرنے اور ادب سکھانے والا دانا آدمی دین و ایمان میں رخنہ ڈالنے والے امراض کا سب سے بڑا عالم اور واقفِ راز ہوتا ہے اس لئے کہ وہ مریض جو عوارض و امراض کا حال محض اپنے تجربے کی روشنی میں بیان کرتا ہے، وہ جو اپنی مصیبت کی وہ کیفیت بیان کرتا ہے جو خود اس کے ساتھ واقع ہوتی ہے تو وہ اپنی بیماری اور مصیبت کا حال صحیح طور پر بیان نہیں کر سکتا اور اس کا اظہار و بیان اصل حقیقت سے مختلف ہوتا ہے۔ ایک ماہرِ فن اور تجربہ کار معالج اپنے مریضوں کو ایسی چیز سے آگاہ کرتا ہے جو فی الحقیقت وہ بھگت رہے ہیں اور ساتھ ایسی باتوں سے بھی خبردار کرتا ہے جن کی ان کے اندر کی حالت ہو گئی ہے یہاں تک کہ ان کی بیان کردہ حیثیت ایک آنکھوں دیکھی حقیقت محسوس ہونے لگتی ہے۔

"اے علم سے نسبت رکھنے والے! جان لو کہ جب تم حالتِ ہوش میں واپس آتے ہو تو اس وقت تم پر حالتِ مدہوشی کے تحیر کا راز کھلتا ہے۔ جب تمہیں افاقہ نصیب ہوتا ہے تو تم اپنے متوالے پن کے زمانے کا ذوق حاصل کرتے ہو۔ جب تمہارا حافظہ بحال ہو جاتا ہے تو اس وقت تم پر غفلت و دیوانگی کی حالت کا راز کھلتا ہے اور سلامتی و عافیت پانے سے ہی تمہیں اپنے مرض کے عرصہ کا احساس ہوتا ہے۔ لہٰذا جان لو کہ مدہوشی اور متوالے پن کی یہ ساری کیفیت جب کبھی واقع ہوتی ہے انسان کو اللہ تعالیٰ کی معرفت کی حقیقت کے پاس کسی اور شغل میں لگائے رکھتی ہے اور یہ کیفیت جس پر بھی وارد ہوتی ہے اسے نقصان پہنچاتی ہے ایسا اس لئے ہوتا ہے کہ اس پر پھر حیرانگی اور سرگشتگی اپنا سایہ کئے ہوئے ہوتی ہے لہٰذا اپنے نفس کے متعلق فکر مند اور اسے مدہوشی، متوالے پن اور تحیر و سرگشتگی کی حالت سے بہت جلد آزاد کرانے کے خواہشمند ہو تو اپنے نفس کو اس کے حال پر چھوڑ دو اور اس امر کی خاطر وہ نسخہ استعمال کرو جو میں تمہارے لئے تجویز کرتا ہوں اور جس چیز کی طرف رغبت دلاؤں اس کی طرف لپک جاؤ اور جس جانب کی میں نشاندہی کروں اس کی طرف ذرا آگے بڑھو اس لئے کہ سچائی کی پاکیزگی اور نیت و مقصود کی عمدگی تمہیں ایسی جگہ پہنچا دے گی جو اس منزل کا راستہ ہے جو تمہیں محبوب ہے لیکن اس مقام سے وہ فرار ہے جو تمہیں ناپسند ہے۔ اور تمہیں اپنے مقصد تک پہنچنے میں سوائے تمہاری کمزوری کے جو تم فریضۂ سعی و عمل کے بجا لانے میں دکھاؤ گے اور کوئی چیز حائل نہیں ہوگی، اور قوت تو بہر حال اللہ تعالیٰ کے اختیار میں ہے لہٰذا بار بار ڈرو اس امر سے کہ تم اس چیز میں، کسی طرح بھی کمزوری کا اظہار کرو یا یہ کہ وہ ذاتِ مقصود کسی لمحہ ایسی حالت میں پائے کہ تم اس سے غافل کسی اور طرف متوجہ ہو۔ اس لئے کہ تمہیں جو امر اپنے مقصود تک پہنچا سکتا ہے وہ یہی ہے کہ تم مجاہدہ و ریاضت کی منزل میں صدق و خلوص کے ساتھ باہم پند و نصیحت پر کاربند رہو۔ یہ نشاناتِ راہ ہیں جن سے میں نے تمہیں آگاہ کر دیا ہے اور تمہیں ایک کھلی اور واضح شاہراہ پر چلنے کے لئے چھوڑ دیا ہے۔

اور تم جو ہمیشہ حذر و احتیاط سے کام لیتے ہو اپنے اندر عمل کی امنگ پاتے ہو اور آگے بڑھنے پر آمادہ ہو تو جان لو کہ وہ صورتِ حال جو تمہیں اور تم جیسے دوسرے افراد کو علم حاصل کر لینے کی خاطر جد و جہد کرنے، اس کے جمع و تحصیل اور ترقی و اضافہ میں مسلسل لگے رہنے کے بعد بھی تمہارے حصولِ مقصد کے راستے میں حارج ہوتی ہے وہ تمہارا تاویل کی طرف میلان ہے اور تمہارے نفس کے اندر دنیا کی طرف جو جھکاؤ ہے اس کی خاطر اس تاویل کا استعمال کرنا ہے جو لوگ ایسا کرتے ہیں، ان کی مختلف کیفیتیں ہوتی ہیں۔ ایک تاویل کرنے والا وہ ہوتا ہے جس کا اپنے نفس کی دبی ہوئی خواہشوں اور امنگوں سے عوارض و اغراض بالکل ظاہر ہوتا ہے چنانچہ وہ اس کیفیت اور اس خامی کے احساس کے باوجود تاویل کا عمل جاری رکھتا ہے اور اکثر اوقات وہ اس طرزِ عمل کو چھوڑتا ہی نہیں۔ یہاں تک کہ ایک وقت میں اس عملِ تاویل کا احساس بھی اس کے اندر باقی نہیں رہتا۔ دوسرا تاویل کرنے والا وہ ہوتا ہے جو اپنی تاویل میں صحت اور تحقیق کا لحاظ رکھتا ہے لیکن اس عمل میں اس کا ذاتی رجحان کچھ اس طرح دخل انداز ہوتا ہے کہ اس کا اسے احساس تک ہونے نہیں پاتا لیکن اس کا اثر اس کے مقصد پر ضرور اثر انداز ہوتا ہے لہٰذا اس حالت

میں وہ جو بھی تاویل کرتا ہے اس پر اسے پورا پورا اعتماد ہوتا ہے۔ اور وہ اسے ہر دو صرف تاویل سے اصل قرار دیتے ہوئے اس پر کاربند رہتا ہے۔ اس کی حالت کا صحیح بیان یہ ہے کہ اس شخص کی تاویل کی غرض و غایت بھی اپنی نوعیت کے اعتبار سے دبی ہوتی ہے جو اوپر بیان کی گئی ہے اور صاحب تاویل جانتا ہے کہ اس کے باطن میں کیا چیز پوشیدہ ہے اور اس کے نفس کی تہہ میں کیا چیز چھپی ہوئی ہے۔ وہ اس لئے کہ اس نے علم کو بطور محض ایک وسیلہ اور سبب کے اختیار کیا۔ علم کے زیور سے اپنے آپ کو آراستہ کیا، اس کا لباس زیب تن کیا۔ اور تاویل کی صورت میں اپنے علم کا اظہار کیا، اس کی طرف لوگوں کو بلایا اور اپنے آپ کو ان میں مشہور کرنے کے لئے پیش پیش دکھا تاکہ لوگوں کو معلوم ہو جائے کہ اس کے پاس کتنا علم ہے۔ پس جب اس کا مقام و مرتبہ لوگوں نے جان لیا اور اس کی شہرت پھیل گئی اور لوگ اس کی طرف رجوع کرنے لگے تو اسے اپنے گرد ہجوم کا یہ مجمع بہت اچھا لگا اور جب لوگوں نے اس میں کسی ایسی بات کی تعریف کی جو اس میں نہیں تھی تو وہ بہت مسرور ہوا اس طرح اس پر تاویل کا غلبہ قوی ہو تا گیا۔ لوگوں کے اتباع ان کی تعریف و توصیف اور کثرت تعظیم اور ان کے اندر اس کی ہر دلعزیزی نے اس کے دل میں یہ خیال راسخ کر دیا کہ جس چیز کا وہ اظہار کر رہا ہے اور دکھا دکھا رہا ہے وہ واقعی اس کے اندر موجود ہے۔ حالانکہ اللہ تعالیٰ کے علم میں جو کچھ ہے وہ اس چیز کے بالکل برعکس ہے جو اس نے دل میں چھپا رکھی ہے۔ جب عوام اور جہلا کے اندر اس کی یہ ساری قدر و منزلت قائم ہو جاتی ہے اور جب غفلت اور غلط فہمی کی بناء پر تعریف کرنے والے اس کی بہت زیادہ تعریف کرنے لگتے ہیں تو وہ اپنے نفس کی یہ دبی ہوئی خواہش پوری کرنے پر آمادہ ہو جاتا ہے کہ جو علم بھی اس نے حاصل کیا ہے اور سیکھا ہے اس کا اجر وصول کرے چنانچہ اس کے علم کا جو اجر اور جو بدلہ اسے فوراً مل جائے وہ اس پر راضی ہو جاتا ہے اس طرح وہ علم فروشی کرنے لگتا ہے اور بہت تھوڑے سے نفع اور کم قیمت پر اپنا علم فروخت کرنے لگتا ہے۔ اعمال صالحہ پر آخرت کے اجر اور اللہ تعالیٰ کے ثواب عظیم کے بدلے اس دنیا ہی کے اجر کو قبول کر لیتا ہے۔ اپنے اس رویے سے اپنے آپ کو ان لوگوں میں شامل کر لیتا ہے جن کی اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب میں مذمت فرمائی ہے۔

"جب خدا نے ان لوگوں سے جن کو کتاب عنایت کی گئی اقرار لیا کہ اسے صاف صاف بیان کرتے رہنا اور اس کی کسی بات کو نہ چھپانا تو انہوں نے اس کو پس پشت ڈال دیا اور اس کے بدلے تھوڑی سی قیمت حاصل کی۔ یہ جو کچھ حاصل کرتے ہیں برا کرتے ہیں۔" (آل عمران ۱۸۷)

پھر آگے سبحانہ نے فرمایا۔

"پھر ان کے بعد ناخلف ان کے قائم مقام ہوئے جو کتاب کے وارث بنے یہ بڑا مال اس دنیائے دنی کا مال و متاع لے لیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ہم بخش دیئے جائیں گے اور اگر ویسا ہی متاع دنیا پھر سامنے آتی ہے تو یہ پھر لپک کر اسے لے لیتے ہیں۔" (الاعراف ۱۶۹)

پس اللہ تعالیٰ نے ان لوگوں کی مذمت فرمائی اور اپنی پاک کتاب میں ان کے قصے ہماری خبر کے لئے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان سے بیان فرمائے اور اس طرح اپنے حاتمل بندوں کو صاف صاف بتا دیا اور تم پر اجر وصول کرنے کی برائی کھول کر اور محکم طریقے سے دضاحت کر دی تاکہ کسی حجت کرنے ... کے لئے اس میں حجت کی گنجائش اور نہ کسی بولنے والے کے لئے ... میں بولنے اور صفائی پیش کرنے کا موقع باقی رہے۔ پھر اللہ تعالیٰ نے ہمارے لئے انبیاء ... کے قصے بیان فرمائے اور ہمیں بتایا کہ وہ کیا صفات اپنے اندر رکھتے تھے اور کس طرح خدا نے ان سے ... بنا دیا تھا۔ وہ دنیا کو ترک کر کے آخرت ہی کے لئے جدوجہد کریں گے اور ... میں کسی چیز پر ... کوئی قیمت وصول کریں گے اور نہ کسی اجر کی امید رکھیں گے اس ...

علم کا حق اور پھر خلق خدا کو اس علم کے پہنچانے کا حق اسی طرح ادا ہو سکتا ہے کہ اس پر کوئی اجر قبول نہ کیا جائے سوائے ربِ ذوالجلال کے ثواب کے اور سوائے اس جنت کے جسے اس نے اپنے متقی اور اطاعت گزار لوگوں کے لئے ٹھکانا بنایا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے فرمایا۔

"اے پیغمبر! کہہ دو کہ میں تم سے اس کا صلہ نہیں مانگتا اور نہ میں بناوٹ کرنے والا ہوں۔" (ص ۸۶)

پھر فرمایا۔

"کہہ دو کہ میں تم سے کوئی صلہ نہیں مانگتا مگر تم کو قرابت کی محبت تو چاہیئے۔" (شوریٰ ۲۳)

اس مضمون کی آیات قرآن حکیم میں بہت سی ہیں اور انبیاء علیہم السلام کا اپنی امتوں کے درمیان اور علماء کا لوگوں کے درمیان ہمیشہ سے یہی طریق چلا آ رہا ہے کہ وہ اپنے علم کی قیمت وصول نہیں کرتے اور نہ اس چیز پر جسے وہ جانتے ہیں کوئی اجر وصول کرتے ہیں۔

اس امر سے ممانعت کے واقعات بہت کثرت سے ہیں اور حجت کے اتمام کے لئے اگر ان سب کو بیان کر دیا جائے تو یہ مکتوب بہت طویل ہو جائے گا۔ امید ہے تم پر تنا کچھ تو واضح ہو ہی گیا ہوگا کہ جو صحیح راہ دکھانے کے لئے کافی ہے اور توفیق عطا فرمانے والا تو اللہ ہی ہے۔

(عمرو بن عثمان کے نام خط سے اقتباس)

روشن کتابوں کی وسیع اور ہمہ گیر اشاعت کے سلسلے میں
ایک نئے انقلابی پروگرام کا اعلان

انتہائی کم قیمت پر مفید روشن کتابوں کی وسیع اور ہمہ گیر اشاعت کے سلسلے میں ہم نے ایک نیا انقلابی پروگرام تشکیل دیا ہے۔
چنانچہ اس نئے انقلابی پروگرام کے تحت







عمل میں لایا گیا ہے

- غلام علی بُک کلب، پاکستان میں مطالعہ کو فروغ دینے کا ایک عوامی منصوبہ ہے۔ وطن عزیز کا ہر شخص بڑی آسانی کے ساتھ اس کا ممبر بن سکتا ہے اور گھر بیٹھے بآسانی روشن کتابیں حاصل کر سکتا ہے۔
- ممبر بننے کے لیے آپ کو کم از کم ۲۵/- روپے کا منی آرڈر ارسال کرنا ہوگا۔ ۲۵/- روپے بھیجنے پر آپ کلب کے مستقل ممبر بن جائیں گے اور ہر مہینے کی یکم، دس اور بیس تاریخ کو گھر بیٹھے چھ انتہائی خوبصورت اور نایاب کتب حاصل کریں گے۔ ان چھ کتابوں میں "انسائیکلوپیڈیا"، "اُردو نثر کی داستان" اور "اُردو شعر کی داستان" کی اقساط اور تین روشن کتابیں شامل ہوں گی۔
- اگر آپ ۵۰/- روپے کی رقم بھیجیں گے تو ہم آپ کو ہر ایک کتاب پر دس فیصد رعایت دیں گے۔ ۱۰۰/- روپے کی رقم پیشگی ارسال کرنے پر یہ رعایت پندرہ فیصد تک بڑھا دی جائے گی۔ ان تینوں صورتوں میں محصول ڈاک ہم ہی ادا کریں گے۔
- رقم موصول ہونے پر ہم آپ کو ایک رکنیت نمبر بھیجیں گے۔ آئندہ آپ اسی نمبر کے حوالے سے ہمارے ساتھ خط و کتابت کر سکیں گے۔
- ہمارے پاس آپ کی رقم بالکل محفوظ رہے گی۔ آپ کو ہر ماہ کی مقررہ تاریخوں پر کتابیں بھیج کر ہم یہ رقم جو کتاب کی اصل قیمت سے بے حد کم ہوگی منہا کر لیں گے اور جب آپ کا حساب بے باق ہو جائے گا تب چند یوم پیشتر آپ کو اطلاع دے دی جائے گی۔ اس طرح غلام علی بُک کلب کا ممبر بننے سے آپ کے قیمتی وقت اور روپے کی بچت ہوگی اور آپ کم وقت میں انتہائی کم قیمت پر نہ صرف اپنے پسندیدہ موضوعات کی کتابیں منگوا سکیں گے بلکہ غلام علی بُک کلب کا ممبر ہونے کی حیثیت سے آپ کو اس کلب کی سرپرستی بھی حاصل ہوگی۔
- غلام علی بُک کلب کا ممبر بننے سے بڑا فائدہ یہ ہوگا کہ آپ روشن کتابوں کے علاوہ جو بھی کتاب طلب کریں گے ہم انہی شرائط پر آپ کو بھجوا دیں گے کیونکہ اس کلب کا اصل مقصد مطالعۂ کُتب کو فروغ دینا ہے۔

آج ہی "غلام علی بُک کلب" کا ممبر بنیے اور اپنے گھر بار کو روشن کتابوں سے بُقعۂ نُور بنائیے!

غلام علی بُک کلب، اَدبی مارکیٹ، چوک انارکلی، لاہور



۲۰-اکتوبر کی روشن کتابیں

تحریکِ پاکستان کے سرگرم کارکن اور عظیم قومی رہنما سردار عبدالرب نشتر
کی شخصیت اور حالاتِ زندگی پر مبنی ایک اہم کتاب



قائداعظمؒ کے دستِ راست

مؤلف: محمد حنیف شاہد

اُردو شعر کا ایک مستند تاریخی و ادبی سلسلہ



اُردو شعر کی داستان

اُردو مثنوی کی تاریخ عہد بہ عہد

وادیِ نربدا و بندھیاچل کے شعری دبستانوں، بیجاپور، گولکنڈہ اور
بیدر کی مثنویوں کا تفصیلی تذکرہ

اُردو شعر کی مکمل تاریخ جاننے کے لیے اِس نئے ادبی سلسلے کا مطالعہ بیحد ضروری ہے۔

مؤلف
اے حمید